جوش کی مرثیہ نگاری: جوش کے تنقیدی تصورات کے تناظر میں

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اردو)

مقالہ نگار: ناصر علی سلیم

رجسٹریشن نمبر:159-FLL/MSURDU/F15

نگران: ڈاکٹر کامران عباس کاظمی

International Islamic University
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD

شعبہ اردو، کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Accession No. TH25596

MS
891.4391
س ل ج

اردو ادب ۔ شاعری
۔ مرثیہ نگاری
۔ ۔ تنقیدی تصورات

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور ایم ایس اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **"جوش کی مرثیہ نگاری: جوش کے تنقیدی تصورات کے تناظر میں"**

مقالہ نگار: ناصر علی سلیم

رجسٹریشن نمبر: 159-FLL/MSURDU/F15

کمیٹی دفاعِ مقالہ

ڈاکٹر سعید احمد
ایسوسی ایٹ پروفیسر
آئی ایم سی بی، ایف۔۸/۴، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
چیئر پرسن، شعبہ اردو

اگست، 2022ء

تصدیق نامہ

ناصر علی سلیم نے رجسٹریشن:159-FLL/MSURDU/F15 کے تحت اپنا تحقیقی وتنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو، بعنوان **"جوش کی مرثیہ نگاری: جوش کے تنقیدی تصورات کے تناظر میں"** میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

کمیٹی دفاع مقالہ منعقدہ اجلاس مورخہ ۳۱ راگست ۲۰۲۲ء میں جو تجاویز دیں اس کے مطابق مقالہ نگار نے درستی کرلی ہے۔ اب یہ مقالہ شعبہ امتحانات کو بھیجنے اور ڈگری جاری کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی

اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اُردو

کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرست ابواب

نام ابواب

پیش لفظ

باب اول: صنفِ مرثیہ کے حوالے سے جوش کے افکار ونظریات

باب دوم: مرثیہ اور عہدِ جدید

باب سوم: جوش کی مرثیہ نگاری

باب چہارم: جوش کی رثائی شاعری (سلام نگاری، رباعیات، نظمیں)

باب پنجم حاصلات

پیش لفظ

یوں تو اردو شاعری بہت سی شعری اصناف سے مالا مال ہے۔ ہر صنف اپنی ضرورت و اہمیت کے اعتبار سے الگ پہچان رکھتی ہے۔ کچھ اصناف مقامی ہیں اور کئی ایک فارسی روایت سے ہم نے مستعار لی تھیں۔ غزل قصیدہ مثنوی وغیرہ جیسی جاندار اصناف کے ہوتے ہوئے مرثیہ نگاری کا مقامی تہذیب سے آغاز ہو جانا معمولی بات نہ تھی۔ مگر شروع ہی سے مرثیہ اور مرثیہ نگاری کی روایت کو ہمارے ہاں تعصب کی نگاہ سے دیکھا گیا ایک عرصے تک کوئی بھی اس نئی صنف کو ادبی صنف ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ بلکہ مرثیہ نگار شعراء کو بگڑا شاعر، بنا مرثیہ گو کا طعنہ دے کر حوصلہ شکنی کی جاتی رہی۔ بہر حال اس میدان کے جدید و قدیم سارے شعراء قابل تعریف ہیں کہ انہوں نے صلے کی تمنا اور ستائش کی پروا کے بغیر اسے جاری رکھا اور آخر کار صنف مرثیہ کو اردو کی گرانقدر اصناف میں شامل کروانے میں کامیاب ہو گئے۔

دیگر شعری اصناف کی طرح مرثیہ کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی۔ گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنتوں کی سرپرستی اور مذکورہ بالا شیعی ریاستوں کے مذہبی جذبے نے مرثیے کی روایت کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں کا مرثیہ ادبی ضرورت سے زیادہ مذہبی رسومات کی ادائیگی کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا۔ یہاں دکن میں مرثیہ غزل اور مثنوی جیسی قدرے آسان اور سادہ ہئیتوں میں لکھا جاتا رہا۔ انقلاب زمانہ مرثیے کو جب دلی میں لایا تو اسے بڑے بڑے جید شعراء کے ہاتھوں سنورنے کا موقع ملا۔ زبان و بیان کی صفائی کے علاوہ ہئیت کے نت نئے تجربوں سے مرثیہ نکھرتا چلا گیا۔ خدائے سخن میر تقی میر نے بھی اس میں طبع آزمائی کی سودا نے اس میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہئیت کے ڈھیروں تجربات کر کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسدس ہی مرثیے کے لیے موزوں ترین ہئیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ جب لکھنؤ منتقل ہوا تو ہئیت کے لحاظ سے مسدس ہی کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ میر ضمیر نے اس کے اجزاء کا تعین کیا اور انیس و دبیر نے اپنی خداداد خلاقانہ صلاحیتوں سے اسے بام عروج تک پہنچا دیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کی یہ واحد مقامی صنف شاعری بیشتر تہذیبی و ثقافتی آثار کی امین ہے۔ مرثیہ نگاری کو شعراء نے واقعہ کربلا کی محض تاریخ نہیں رہنے دیا بلکہ ثقافتی و تہذیبی اقدار کی آئینہ دار بنا کے پیش کیا ہے جس سے اس کی اہمیت دو چند ہو گئی۔

روایتی مرثیہ مجلس کی ضرورت کے لیے شروع ہوا تھا مومنین کے جم غفیر کے سامنے شعراء مرثیہ پڑھتے اور خوب داد سمیٹتے۔ میر انیس نے اسی موقع پر کہا تھا:

ششدر نہ ہو کیوں چرخ عجب جلوہ گری ہے

یہ بزم عزا آج ستاروں سے بھری ہے

انیس و دبیر کے بعد بھی ان کے خاندان کے شعرا کلاسیکی روایت کے مطابق مرثیہ نگاری کرتے رہے لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں ہی کلاسیکی روایت ماند پڑنے لگی اور جدید مرثیے کے معماروں نے اس میں کربلائی واقعات کے بجائے زمانے کے سیاسی واقتصادی اور سماجی آلام کو موضوع بنانا شروع کر دیا۔ جس سے کلاسیکی مرثیے کی معنوی ہیئت کچھ کی کچھ ہوگی۔ نہ صرف مرثیے کے اجزا اور مضامین میں بہت بڑا انحراف سامنے آیا بلکہ بعضوں نے تو آزاد اور نثری مرثیہ بھی کہنا شروع کر دیا۔ اس سے قبل انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے شروع میں شخصی مرثیے بھی لکھے گئے حالی اور علامہ اقبال اس سلسلے کے اہم شعراء ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جوش ملیح آبادی جدید مرثیے کے علمبردار کے طور پر سامنے آئے ہیں واضح طور پر ان کے مراثی کلاسیکی روایت سے انحراف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ میرے اس تحقیقی مقالے کا عنوان ''جوش کی مرثیہ نگاری: جوش کے تنقیدی تصورات کے تناظر میں'' ہے۔ اس مقالے کے درج ذیل پانچ ابواب ہیں۔

باب اول: صنف مرثیہ کے حوالے سے جوش کے افکار ونظریات

باب دوم: مرثیہ اور عہد جدید

باب سوم: جوش کی مرثیہ نگاری

باب چہارم: جوش کی رثائی شاعری

باب پنجم: حاصلات

موضوع کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے پہلے باب میں جوش کے مرثیہ سے متعلق افکار کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں اس عہد کے نمایاں خدوخال کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جس کے اندر جوش ملیح آبادی کو کلاسیکی روایت توڑ کر جدید مرثیے کی طرف جانا پڑا۔ عہد جدید کا جائزہ لینے کے بعد جوش کے تمام مرثیوں کا ان کے افکار کی روشنی میں مرحلہ وار جائزہ لیا گیا۔ مرثیوں کے علاوہ سلام و رباعیات اور کچھ ایسی رثائی نظمیں بھی موجود ہیں لہٰذا چوتھے باب کو جوش کی رثائی شاعری کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس باب میں بھی جوش کے رثائی نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی سلام نگاری رباعی نویسی اور اس سلسلے کی دیگر نظموں کا محاکمہ کیا گیا ہے۔

مقالے کے آخری باب حاصلات کے اندر جوش کی مرثیہ نگاری اور رثائی شاعری کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔جس سے اردو مرثیہ نگاری میں جوش کے مقام و مرثیے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔جوش کے افکار کی روشنی میں ان کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لینے کے بعد جو نتائج برآمد ہوئے اس آخری میں قلم بند کیے گئے ہیں۔

مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں اپنے نگران ڈاکٹر کامران عباس کاظمی کی معاونت کو کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کرسکتا۔میں ان کا بطور خاص شکر گزار ہوں۔یونیورسٹی کے دیگر تمام اساتذہ سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ تمام اساتذہ کرام کی محنت اور محبت کا بھی احسان مند ہوں۔

راقم الحروف نے اس مقالے کو بہتر سے بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے،تاہم اس سلسلے کی اس کاوش کو میں حتمی قرار نہیں دے سکتا،آئندہ مطالعے کی روشنی میں جو کمی رہ گئی ہے اسے پورا کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔

ناصر علی سلیم

ایم ایس اُردو

باب اول:
صنفِ مرثیہ کے حوالے سے جوش کے افکار و نظریات

صنفِ مرثیہ کے حوالے سے جوش کے افکار ونظریات یا تو باقاعدہ انٹرویوز کی صورت میں موجود ہیں یا مختلف مضامین میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرثیہ کے حوالے سے ان کے نظریات کو ہم ان کی اپنی مرثیہ نگاری سے بھی اخذ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا صنفِ مرثیہ کے حوالے سے ان کے افکار ونظریات کو مندرجہ ذیل دو کیٹگریز میں رکھ کر دیکھتے ہیں:

الف: باقاعدہ انٹرویو+ مضامین

ب: ان کی شاعری سے اخذ شدہ نظریات

الف: انٹرویو+ مضامین

اس سلسلے میں ڈاکٹر ہلال نقوی کی کتاب ''جدید مرثیے کے تین معمار'' بہت اہم ہے۔ مذکورہ انٹرویو کا خلاصہ اگر اپنے الفاظ میں لکھوں تو مرثیہ کے اعتبار سے جوش کی تنقیدی آراء کے اہم ترین نقاد ہمارے سامنے آ جائے گے۔

☆ جوش نے کب اور کیوں مرثیہ نگاری کا انتخاب کیا۔

☆ مرثیہ کے لیے بحروں کے انتخاب سے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔

☆ مرثیہ نگاری کے لیے وہ کونسی ہیئت پسند کرتے ہیں اور اس کی وجہ کیا ہے۔

☆ مرثیہ نگاری کی صنف سے وہ کونسا کام لینا چاہتے ہیں اور یہ کہ وہ اس کے ذریعے کوئی تبدیلی لانے میں کامیاب بھی ہوئے یا نہیں۔

☆ آیا وہ مرثیہ نگاری کو رونے رلانے تک محدود سمجھتے ہیں یا اسے ملت کی بیداری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

☆ طول تاریخ میں کلاسیکل مرثیے کو آہ و بکا ہی کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا۔ کیا اس دور میں آہ و بکا کوئی مقصد تھا، یا کبھی بھی بکا کو مقصد بنایا جاسکتا ہے۔

☆ اس انٹرویو سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ جوش قدیم و جدید شاعری میں حد فاصل کیسے قرار دیتے

ہیں۔

☆ کیا مرثیہ گو کے لیے متدّین ہونا ضروری ہے اور مرثیہ نگار کا علمی پایہ کتنا ہونا چاہیے۔

☆ جوش ملیح آبادی نے اس انٹرویو میں ان وجوہات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے جن سے ابھی تک مرثیہ کو اس کا جائز مقام حاصل نہیں ہوسکا۔

☆ کلاسیکل مرثیے کے بعد جدید مرثیے نے کتنا سفر طے کیا ہے اور اسے بڑھانے میں کامیابی کتنی حاصل کی ہے۔

☆ جدید دور میں تلوار اور گھوڑے کے مضامین پر تخیل کے گھوڑے دوڑانا جوش کے نزدیک محض تضیع توانائی ہے، لہٰذا انکی مرثیہ نگاری میں اس چیز کا فقدان درحقیقت ان کے میلان طبع کے خلاف ہے۔

☆ اس انٹرویو سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جوش ملیح آبادی کے نزدیک جدید مرثیہ کیا ہے اور قدیم مرثیہ چاہے، جدید دور میں لکھا جائے اسے وہ قدیم ہی سمجھتے ہیں۔

☆ جوش کا خیال ہے بیسویں صدی کے مرثیہ نگار کا یہ فریضہ ہے کہ اس کا مرثیہ تاسئ حسین پر ابھارے۔

☆ جوش ملیح آبادی کا خیال ہے انیس و دبیر جیسے بلند پایہ مرثیہ نگاروں کے بعد بھی جدید دور کے مرثیہ نگار اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انکے خیال میں تلوار اور گھوڑے کی شاعری کو ترک کرکے ملت کو گرمانا درحقیقت نئے راستے کی دلیل ہے۔

☆ آزاد مرثیے کو وہ شاعرانہ صلاحیت نہ ہونے کے مترادف سمجھتے ہیں۔

جوش کی تنقیدی فکر کو سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ انیس و دبیر کے ہوتے ہوئے مرثیہ نگاری کی طرف راغب کیوں ہوئے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی کو انہوں نے مرثیہ نگاری کی طرف راغب ہونے کی وجہ یہ بتائی تھی۔

”ایک دن ایک بہت بڑے انگریز افسر نے جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں اور جو

بہت بڑے عہدے پر فائز تھا۔عربی اور فارسی بھی جانتا تھا۔ مجھ سے کہا کہ آج محرم کی ساتویں تاریخ ہے، میں نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگا آپ محرم سے واقف ہیں؟ میں نے اس سے کہا کہ صاحب آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں! کہنے لگا ہاں میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے حسینؑ کی شہادت سے کیا فائدہ اٹھایا، آپ صرف آنسو بہاتے ہیں۔ جوش صاحب اگر صرف مٹھی بھر مسلمان حسینؑ کی اسپرٹ کو سمجھ لیں تو برٹش ایمپائر تین مہینے میں ختم ہو جائے، یہی وجہ تھی کہ میں ایک نئے جذبے کے ساتھ ''مرثیے'' کے میدان میں آیا۔''(۱)

انگریز افسر کی بات سن کر یہی لگتا ہے کہ جوش ایک نئے جذبے اور نئی فکر کے ساتھ مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے ہوں گے، ان کے پیش نظر پرانی ڈگر پر چلتے ہوئے مجلس و ماتم کی مذہبی رسومات کی ادائیگی کا خیال قطعاً نہ تھا، حالانکہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے کلاسیکی مرثیے کی اجزائی ترکیب کا جوش تو اچھی طرح علم تھا۔مگر جوش نے بکا اور بین سے قصداً انحراف کرکے نئی طرز کا مرثیہ لکھنا شروع کیا۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں جدید مرثیے کی تعریف کچھ اس طرح بیان کی۔

''جو مرثیہ تأسی حسین پر ابھارے وہ جدید ہے اور وہ مرثیہ جو تأسی حسین پر نہ ابھارے چاہے اس جدید عہد میں لکھا جائے لیکن وہ قدیم مرثیہ ہی کہلائے گا۔''(۲)

جوش سے پہلے مرثیے کا اختتام بکا پر ہوتا تھا، کسی دور میں یہ بھی احتجاج کا ایک موثر ذریعہ رہا ہے کیونکہ ریاستی طاقت مخالفین کے پاس چلی گئی تھی، اس کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا لہٰذا مرثیے کی تان بکا پر ٹوٹتی تھی اب جبکہ سیاسی حالات بدل چکے ہیں تو نئے زمانے میں مرثیہ نگار کو ہمت تازہ کرنے اور باطل سے لڑنے کا ولولہ پیدا کرنا چاہیے، چنانچہ جوش نے مرثیوں میں یہ انداز اپنایا۔

مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو

لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابن علی ہو

زہر سے لبریز ہے جام حسینؑ ابن علی

جان دینا ہو تو لو نام حسینؑ ابن علی

ایسا نہیں کہ جوش غمِ شاہ کے خلاف ہیں، لیکن وہ گریہ کو زندگی کا نصب العین نہیں سمجھتے۔

کون کہتا ہے کہ دل کے حق میں غم اچھا نہیں

پھر بھی شغلِ گریہ نصب العین بن سکتا نہیں

ذاکر سے خطاب میں بھی وہ اس جانب متوجہ کرتے ہیں۔

مشقِ گریہ عیش کی تمہید ہے تیرے لیے

عشرۂ ماہِ محرم عید ہے تیرے لیے

مرثیہ سے متعلق فکری نقطہ نظر کے علاوہ فنی لحاظ سے بھی جوش مرحوم کی آراء بنیادی نوعیت کی ہیں۔ بحر و خیال کے لحاظ سے انھوں نے ڈاکٹر ہلال نقوی کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

''ہر خیال اپنے ساتھ بحر لاتا ہے، بحر درحقیقت خیال کا انتخاب ہوتا ہے نہ کہ شاعر کا''(۳)

مزید برآں مرثیے کی ہیئت کے بارے میں بھی ان کی مخصوص رائے ہے۔

''فارم میں تبدیلی لانا کوئی ضروری نہیں ہے مسدس میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ جن میں موسیقیت بھی ہوتی ہے اور گنجائش بھی، اثر اور جوش دونوں باتیں اس سے پیدا ہوتی ہیں اس لیے مسدس مرثیے کے لیے بہترین شکل ہے۔''(۴)

موزوں طبع ہونے کے علاوہ مرثیہ گو شاعر کے لیے جن شرائط کی ضرورت ہے، علم کو وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں ہلال نقوی سے جوش نے کہا تھا۔

''حیات جس قدر اجازت دے ہر علم سے کچھ نہ کچھ ہنر یاب ضرور ہو۔'' (۵)

چنانچہ ہم جوش کے مرثیوں میں دینی و مذہبی اور تاریخی حوالوں کے علاوہ بہت علوم انسانی کے جلوے دیکھ سکتے ہیں، موجد و مفکر، آگ اور ارتقائے خاک جیسے مرثیوں میں علوم کی جلوہ فرمائی بکثرت دکھائی دیتی ہے۔

اس حوالے سے ان مرثیوں کے چہرے بطور خاص پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ مرثیے سے ہٹ کر بھی الگ نظم ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جوش نے کچھ مرثیوں کے چہرے الگ طور پر بھی شائع کروائے تھے۔

جوش نے گھوڑے اور تلوار کو بوجوہ تضیعِ توانائی قرار دیا تھا ان کی جگہ وقت کے علمی تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا۔ گھوڑا اور تلوار پرانے دور میں طاقت کی علامت تھے جبکہ جدید دور میں جدید علوم کو قوت و طاقت خیال کیا جاتا ہے۔

تکنیکی طور پر دیکھا جائے تو اپنے تصور شاعری کے مطابق جوش ایسی بحریں استعمال کی ہیں جو ان کے خیالات سے بہر طور مطابقت رکھتی تھیں زود گو اور بسیار نویس ہونے کے سبب جوش کے مزاج سے مسدس ہی ہم آہنگ ہو سکتی تھی چنانچہ مرثیہ میں ہئیت کے نئے تجربے کرنا جوش نے مناسب نہیں سمجھا۔

جوش کے انٹرویو کے ان اقتباسات سے ان کے بیشتر تنقیدی تصورات ہمارے سامنے آگئے ہیں ان کی دیگر رثائی تنقیدی آراء ان کے لکھے گئے دیباچوں اور ان کے اشعار سے بھی تلاش کی جا سکتی ہیں۔

مرثیہ کی ہئیت، اسلوب، مواد اور زبان پر ان کی رائے کو سامنے رکھ کر جوش کی ذاتی مرثیہ نگاری کا جائزہ لینا آسان ہو جائے گا۔

ڈاکٹر ہلال نقوی کو دیئے گئے انٹرویو کے علاوہ دو مقامات پر مرثیہ کے بارے میں جوش نے اپنی رائے پیش کی ہے۔ اگرچہ یہ آراء وہ کسی شاعر کی مرثیہ کی کتاب پر دے رہے تھے، پھر بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بطور

مرثیہ نگار وہ اس بارے میں کیا نظریات رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی کے مرثیہ ''اذان مقتل'' کے دیباچے میں جوش کچھ یوں رقم طراز ہیں۔

''میں اس صنف سخن یعنی مرثیے کے میدان میں ان کی روایت شکنی کی داد دیتا ہوں، انہوں نے لوگوں کو رلایا نہیں جگایا ہے۔ حسین ان کے یہاں ایک مخصوص فرقے یا گروہ کے رہبر نہیں۔ بلکہ پوری کائنات کے رہنما ہیں۔ یہاں ہلال نقوی نے عصرِ حاضر کے مطالبات کو اپنی انوکھی فکر اور ندرتِ بیان سے ربط دے کر ایک نئے رخ سے پیش کیا وہ ابتدائے شاعری ہی میں اس ارتقائی منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ تاریخ ادب ان کو نظر انداز نہیں کر سکے گی۔ جذبات پرستوں کے اس ماحول میں وہ عقل کی مشعل لے کر نکلے ہیں۔ ان کا دل مضبوط، فکر ترقی پسند، عقل روشن اور ذہن باغیانہ ہے۔ وہ صحیح معنوں میں انقلابی ہیں۔'' (۶)

سید آل رضا کے مرثیے بعنوان: ''عظمتِ انسان'' کے دیباچے میں جوش ملیح آبادی نے مرثیہ سے متعلق اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا تھا:

''۔۔۔ مرثیوں سے ہمیشہ آنسوؤں اور آہوں کا کام لیا گیا اور کسی ایک مرثیہ گو نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی ہے کہ حسینؑ کے کردار کو پیش کر کے مومنین کو یہ سبق دے کے دیکھو اگر تم حسینی ہو تو خبردار باطل طاقت کے سامنے سر نہ جھکانا اور فرماں روایان دہر کو خاطر میں نہ لانا۔'' (۷)

اسی طرح ہلال نقوی کے مرثیہ کائنات انقلاب پر جوش نے کچھ یوں تبصرہ کیا تھا۔

''۔۔۔ مرثیہ نگاروں نے حسینؑ کے تبسم چہرے کی صباحت اور زمین کے سینے میں گڑے ہوئے انکے قدموں کی استقامت کو اجاگر نہیں کیا ہے۔'' (۸)

ایک اور مقام پر جوش کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''۔۔۔مرثیوں میں بڑے بڑے مبالغے کیے گئے اور شہدائے کربلا کے مکالمات میں اپنی طرف سے قیامت کے تصرفات سے کام لیا گیا۔''(۹)

جوش کے اپنے انٹرویو اور ہلال نقوی کے بارے میں ان کی رائے کو سامنے رکھا جائے تو مندرجہ ذیل باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ہلال نقوی کی کتاب کے دیباچے میں انہوں نے جو کچھ کہا اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مرثیہ کو رونے کے بجائے جگانے کا سامان سمجھتے ہیں۔ اس تحریر کا بنظر غائر جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ مرثیے سے انقلاب، ترقی پسند اور عقول کو روشن کرنے کا کام لینا چاہتے ہیں اور یہی توقع جدید مرثیہ نگاروں سے رکھتے ہیں۔

صنف مرثیہ سے متعلق جوش کے افکار و نظریات انکی اپنی شاعری سے بھی اخذ کیے جاسکتے ہیں وہ جا بجا اپنی رائے پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو حسینی ہے، کسی قوت سے مر سکتا نہیں
موت سے ٹکرا کے بھی ساونت مر سکتا نہیں
کون کہتا ہے کہ دل کے حق میں غم اچھا نہیں
پھر بھی شغل گریہ یہ نصب العین بن سکتا نہیں
اشک بے سوز دروں پانی ہے، ایماں کی قسم
اپنے ایک سلام میں وہ یوں گویا ہوتے ہیں
صرف رو لینے سے قوموں کے نہیں پھرتے ہیں دن
خوں فشانی بھی ہے لازم اشک افشانی کے ساتھ(۱۰)

یعنی محض اشک افشانی کی وہ اقبال کی طرح اندوہ و دلگیری سمجھتے ہیں۔قوم کی زندگی خوں فشانی یعنی خون پسینے کی محنت اور جدوجہد کی طلب گار ہے۔(۱۱)

ایک اور سلام کے مقطع میں جوش شیون کے عوض کامرانی چاہتے ہیں۔

جوش، ذکر جرات مولا پہ شیون کے عوض
رخ پہ شان فخر و ناز کامرانی چاہیے(۱۲)

علامہ ضمیر اختر نقوی نے جوش کے فکری موضوعات اور جدید فنی تقاضوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جوش نے اپنے اصول مرثیہ کو اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''اور پھر یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ مرثیوں سے ہمیشہ آنسوؤں اور آہوں کا کام لیا گیا ہے۔ اور کسی ایک مرثیہ گو نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی ہے کہ حسین کے کردار کو پیش کر کے مومنین کو یہ سبق دے کہ دیکھو اگر تم حسینی ہو تو خبردار باطل کے سامنے کبھی سر نہ جھکانا اور فرماں روایان دہر کو خاطر میں نہ لانا۔''(۱۳)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مرثیے میں کردار حسینؑ کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں اور حسینؑ کا کردار یہی ہے کہ باطل کے سامنے سرنگوں ہو جانے کے بجائے، اس کے سامنے ڈٹ جانا۔ڈاکٹر ہلال نقوی نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ جوش کے مرثیوں کی تدوین کا سرانجام دیا ہے، تدوین کے ساتھ اہم ترین تحقیقی نوٹ بھی لکھے۔اس کتاب سے یہ اقتباس بڑا اہم ہے کہ اس سے جوش کے مرثیہ سے متعلق تنقیدی نظریات سامنے آتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے جوش کی نظم ، ذاکر سے خطاب، سے پہلے جوش کے حاشیہ کو مختصراً یوں درج کیا ہے کہ ذاکر حسینؑ کے فرائض ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

۱۔ واقعات کربلا کے بیان میں صحتِ واقعہ پر نظر

۲۔ روحِ شہادت کا بیان

۳۔ ملت کو بیدار کرنے کی سعی

۴۔ مظلوم جذبات کے بجائے فاتحانہ عزائم کی پرورش

۵۔ شہید اعظم کی قربانی کے مقاصد پر زور

۶۔ ۔۔۔اور باطل سے نہ ڈرنے کی جرات (۱۴)

محولہ بالا اقتباس کو پڑھ کر یہ واضح ہوتا ہے کہ جوش نہ صرف مرثیہ نگاروں سے ملت کو بیدار کرنے کی توقع رکھتے ہیں بلکہ جوش اہلِ منبر یعنی ذاکرین و واعظین سے بھی امید باندھتے ہیں۔ کہ وہ شہادت کی اصل روح اور امام کی عظیم قربانی کے مقاصد کو عوام تک پہنچائیں۔ تاکہ ملت اسلامیہ خصوصاً برصغیر کے محکوم لوگ انگریز سامراج سے نجات حاصل کرسکیں۔

اگلے ابواب میں جوش کے انہی افکار و نظریات کی روشنی میں ان کے مراثی کا جائزہ لیا جائے گا۔ ان اقتباسات سے کافی حد تک مرثیہ سے متعلق ان کے نظریات ہمارے سامنے آچکے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جدید مرثیے کے تین معمار، پاکستان ریڈوز گلڈ، کراچی، سن ندارد، ص ۱۱

۲۔ ایضاً، سن ندارد، ص ندارد

۳۔ ایضاً، سن ندارد، ص ندارد

۴۔ ایضاً، سن ندارد، ص ندارد

۵۔ ایضاً، سن ندارد، ص ندارد

۶۔ ملیح آبادی، جوش، مقتل و مشعل (دیباچہ) مشمولہ: اذان مقتل، مصنفہ: ہلال نقوی، محمدی ٹرسٹ لندن، کراچی، ۱۹۶۷، ص

۷۔ ملیح آبادی، جوش، خراج محبت (دیباچہ) مشمولہ: بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، مصنفہ: ہلال نقوی، مکتبہ تعمیر ادب لاہور، س، ص ۱۰

۸۔ ملیح آبادی، جوش، تبصرہ (دیباچہ) مشمولہ: بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، ہلال نقوی، محمد ٹرسٹ کراچی، لندن، ص ۳۸۸

۹۔ ملیح آبادی، جوش، تبصرہ (دیباچہ) مشمولہ: بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، ہلال نقوی، س۔۔۔۔، ص

۱۰۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، عرفانیات جوش (مرتبہ)، ادارہ حیاء تراث اسلامی، کراچی، ۱۹۹۲ء، س ۱۱۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۱۳۔ نقوی، ضمیر اختر، ڈاکٹر، اردو مرثیہ پاکستان میں، مرکز علوم اسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۶

۱۴۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سنٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء، ص ۲۹۴

باب دوم:
مرثیہ اور عہدِ جدید

برصغیر میں مرثیے کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اردو شاعری کی روایت قدیم ہے۔ لہٰذا اس باب میں مرثیے کی پوری کلاسیکی روایت اور اس کے ارتقائی مراحل کی تاریخ مقصود نہیں، بلکہ جدید مرثیے کا تعارفی پس منظر ہی بیسویں صدی سے شروع کیا گیا ہے۔ یہ صدی برصغیر کی تاریخ میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد برٹش راج مضبوط انداز سے قائم ہو چکا تھا۔ محکوموں پر حاکمانہ تہذیب کے اثرات پڑنے لگے، انگریزی تعلیم، سیاسی طور طریقے اور سماجی رسم و رواج غیر محسوس طور پر بدل رہے تھے۔ علی گڑھ تحریک کے نتیجے میں معاشرے میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو چکے تھے، جنہوں نے انگریزی تسلط کی ذلت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ دوسروں کو بھی اس کا احساس دلایا۔ سیاسی طور پر کانگریس اور پھر مسلم لیگ کا قیام بھی اسی طرز کی کوشش کا نام ہے، کہ انگریزی راج میں رہتے ہوئے بھی اپنے حقوق کو کیسے بازیاب کروانا ہے۔ برصغیر کے معروضی حالات بھی نئے مرثیہ نگاروں کو پرانی ڈگر سے ہٹنے کے لیے کافی تھے کہ اچانک پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ کئی لحاظ سے یہ تباہ کن جنگ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے بھی مصائب و آلام کا سبب بنی۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں اتحاد ملت مسلمہ کی واحد علامت خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ برصغیر میں یہ صدمہ اس لحاظ سے بھی ناقابل برداشت تھا کہ جن طاقتوں نے یہ ظلم ڈھایا برطانیہ ان کا ہراول دستہ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ ان حالات میں مولانا محمد علی جوہر نے احیائے امت مرحوم کی خاطر کربلا کا استعارہ استعمال کیا۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

علامہ اقبال بھی کم و بیش انہی حالات کے پروردہ تھے۔ وہ اپنی شاعری میں جا بجا حسین کربلا، یزید اور کوفی و شامی جیسے استعارے استعمال کرنے لگے، جو کہ درحقیقت جدید اردو مرثیے کی تشکیل کا بنیادی مواد فراہم کر رہے تھے۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستاں حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

در نوائے زندگی سوز از حسین
اہل حق حریت آموز از حسین

اک فقر ہے شبیری ، اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی، سرمایۂ شبیری

مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کے ان اشعار سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ آنے والے جدید مرثیے کے تیور کیا ہوں گے۔ کلاسیکی مرثیے میں انیس و دبیر نے کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی کہ اس میں کوئی اضافہ کیا جاسکتا، اگرچہ ایک عرصہ تک ان کے بعد بھی ان کے تتبع میں کلاسیکی انداز کے مرثیہ کی روایت موجود رہی۔ بلکہ کسی نہ کسی طرح وہ روایت موجودہ دور میں بھی چل رہی ہے۔ مگر یہ پرانے انداز کا مرثیہ صرف مجالس حسین میں محبان حسین کی گریے کی ضرورت ہی پوری کرتا ہے۔ جدید دور میں لکھے جانے والے اس طرز کے مرثیے کو جوش ملیح آبادی جدید مرثیہ نہیں سمجھتے بلکہ یہ روایتی، کلاسیکی مرثیے کا تسلسل ہی ہے۔ جبکہ خالص جدید مرثیہ اپنے اندر جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ایک فکری و انقلابی شان رکھتا ہے۔ جو اپنی فکری و انقلابی توانائی کربلا سے حاصل کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ہلال نقوی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' میں اقبال کے اس مصرع

رمز قرآں، از حسین آموختیم

سے متعلق پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''میں (یوسف سلیم چشتی) نے ایک دفعہ حضرت اقبال سے دریافت کیا کہ رمز قرآں سے آپ کی کیا مراد ہے، تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ تعلیمات قرآن کی روح یہ ہے کہ باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر وقت سر بکف رہو اور اگر ضرورت ہو تو جان دینے سے بھی دریغ مت کرو۔''(۱)

ہر عہد، اپنے گذشتہ کے لحاظ سے جدید ہوتا ہے اور آئندہ کے لیے ہزاروں امکانات کا حامل بھی۔ اس لیے ادبی افق پر بھی اسلوب و ہئیت اور موضوعات کے ستارے بدلتے رہتے ہیں، جو اپنے عہد میں نئے ذوق و مذاق کو جنم دے کر ایک جدید راہ متعین کرتے ہیں۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نئے حالات کسی دور کے ادب کے پروردہ نہیں ہوتے بلکہ فلسفہ تاریخ کے ماہرین انہیں تاریخی جبر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ شاعر اور ادیب کا کام نئے حالات کے واقعات کو درج کر دینا نہیں ہوتا۔ ان کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخ کے پس منظر کو سامنے رکھ کر اس عہد کے ضمیری خمیر کی تخیل گری کرنا اور اس عہد کے جذبات کو آئینہ بنا کر پیش کرنا۔ تاریخی پس و پیش سے ہٹ کر ذات کی مقامیت میں کھو جانا بڑے لکھاری کا مقام نہیں۔

انیسویں صدی کے اختتام تک مغربی اقوام مشینی صنعتوں میں بڑی ترقی حاصل کر چکی تھیں۔ نئی ٹیکنالوجی کے متعارف ہونے سے پروڈکشن کے ذرائع بدل گئے، سماج میں نئے طبقات کا ظہور ہونے لگا، معاشی طور پر انسان ایک اور طرح کے سرمایہ داری نظام میں داخل ہوگیا۔ دولت کی دوڑ میں انسان اندھا دھند شامل ہوا تو نئی سے نئی منڈیوں کی تلاش وجستجو نے بدترین قسم کے امپیریل ازم کا راستہ دکھا دیا۔ ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے اور دولت کے حجم کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی وجہ سے آخر کار وہی ہوا، جس کا خوف تھا۔ عالمی جنگوں نے بری طرح ہلا کے رکھ دیا۔ ایک طرف کروڑوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں تو دوسری طرف غربت، بے روزگاری اور معذوری نے ڈیرے ڈال دیئے۔ تاریخ کی بدترین کساد بازاری نے معیشت کا بھرکس نکال دیا۔

انقلاب روس سے مزدور تنظیموں کو تقویت ملی، سامراجی و استبدادی قوتوں کے خلاف مقامی باشندوں میں ایک خاص قسم کی نفرت پیدا ہوئی۔ جس کے نتیجے میں آزادی کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ ان حالات میں شاعر و ادیب کے لیے موضوعات کے چناؤ میں کوئی کمی نہ تھی۔

سائنسی ترقی کے ساتھ سماج کے ڈھانچے میں واضح تبدیلی آئی۔ معاشی و سیاسی میدانوں میں بھی نئے جوڑ توڑ سامنے آئے۔ سرمایہ داری و اشتراکیت کا ٹکراؤ سامنے کی بات ہے۔ پہلی جنگ عظیم نے سلطنتوں کو توڑ کر ریاستوں میں بدل دیا۔ اس سے پہلے ہی قومی ریاستوں کے قیام کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ زبان، رنگ، نسل کی بنیاد پر مختلف خطوں پر قومی ریاستیں وجود میں آنے لگیں، خصوصاً یورپ اور لاطینی امریکہ میں یہ کام بری تیزی سے ہوا۔ بدلتی ہوئی صورت حال کا محکوم قوموں نے بھی اثر لیا۔ برصغیر پاک و ہند میں بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں بدلتی ہوئی دنیا کے اثرات کا نقش اردو ادب، خصوصاً شاعری میں بڑا واضح ہے۔

اردو ادب میں یہ دور پابند نظم کا اہم ترین دور ہے۔ حالی و آزاد کے بعد علامہ اقبال اردو نظم کے جدید خیالات سے ثروت مند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ فکر و فن کے نئے افق، اردو شاعری میں متعارف کروا رہے تھے۔ ''ہمالہ'' سے لے کر ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' تک ان کے ہاں اسلوب، فکر، ہیئت کی ایک پر شکوہ بہار نظر آتی ہے۔ سیاسی، سماجی اور اقتصادی مضامین کو پہلی دفعہ باقاعدہ موضوع بنا کر پیش کیا گیا۔ اگرچہ اس سے پہلے نظیر اکبر آبادی کی عوامی موضوعات پر ہمیں نظمیں پڑھنے کو ملتی ہیں، مگر ان نظموں میں وہ شکوہ اور وہ تنوع نہیں ہے جو اقبال کی نظموں کا خاصہ ہے۔

علامہ اقبال کے معاصرین میں سے مولانا محمد علی جوہرؔ کے انقلابی طرز فکر کو بہر طور درخور اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی کتاب ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی، مولانا کے بارے میں یہ رائے پیش کی ہے۔

> ''۔۔۔ واقعہ کربلا اور اس کی تعلیمات کا انقلابی، سیاسی مفاہیم میں استعمال اردو کی باغیانہ، مجاہدانہ شاعری میں نیا نہیں، اس کا سراغ مولانا محمد علی جوہرؔ کی غزلیہ شاعری

تک آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ شاگردی انہوں نے داغ کی کی تھی لیکن کلاسیکی علامتوں کے پیرائے میں احتجاجی شاعری کا فیضان انہیں حسرت موہانی کی ان غزلوں سے پہنچا تھا جو بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں قید فرنگ میں کہی گئی تھیں۔"(۲)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۸۴ پر مولانا جوہؔر کے اس مشہور شعر

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کے علاوہ سات آٹھ دیگر اشعار بھی درج کیے ہیں۔ جن کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا محمد علی جوہؔر کی شاعری کا انقلابی محرک یہی چیز ہے جسے ایک طاقتور استعارے کی حیثیت ملی ہے۔

ہے بعد کربلا سے بھی قرب یزید بھی
اور چاہتے یہ ہیں کہ نہ ہوں پنجتن سے دور
مسلم اجل سے دور نہیں روز کربلا
رہتا نہیں برات میں دولہا، دلہن سے دور
ہم عیش دو روزہ کے بھی منکر نہیں لیکن
ایمان شہ کرب و بلا اور ہی کچھ ہے
ماتم شبیر ہے آمد مہدی تلک
قوم ابھی سوگوار دیکھئے کب تک رہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میر کے لیے ہے
مطلب فرات سے ہے نہ آب حیات سے
ہوں تشنہ شہادت و شہدائے کربلا
جب تک کہ دل سے محو نہ ہو کربلا کی یاد
ہم سے نہ ہوسکے گی اطاعت یذید کی

الغرض، جوش ملیح آبادی کو وہ زمانہ ملا، جو ہر اعتبار سے انقلابی فضا کا حامل تھا، اس پر مستزاد یہ کہ جوش اپنی افتاطبع کے لحاظ سے بھی سراسر پرجوش تھے۔ جینیاتی طور پر حرارت اور گرمی جذبات کے جراثیم انہیں پٹھان اباؤ اجداد سے بھی منتقل ہوئے ہونگے۔ برطانوی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا، جوش سے بعید نہ تھا۔ جوش کا شمار نظم کے علمبردار شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ حیران کن حد تک بسیار گو شاعر تھے۔ لہٰذا مرثیے کو مسدس کی ہئیت میں نبھانا ان کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ چنانچہ اپنی پہلی ہی کتاب ''روح ادب'' میں آوازہ حق کے عنوان سے ایک جاندار مرثیہ لکھ کر اس میدان میں اپنے لیے امکانات کے راستے ہموار کر دیئے، اور اس دور کی ادبی دنیا کو متوجہ کرنے میں بھی کامیاب ہوگئے۔ ''جدید اردو مرثیہ'' کے مصنف محمد رضا کاظمی نے بیسویں صدی کے مرثیے میں جدت فکر کی وجہ یہ بتائی ہے۔

''۔۔۔جب مرثیہ کا مستقبل بن کر جوش ملیح آبادی سامنے آئے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۵ء تک جدید مرثیے کو ادبی تجربے پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ مگر ۱۹۳۵ء میں ایک ایسا سانحہ درپیش ہوا جس نے اس طرز مرثیہ گوئی کی افادیت مسلم کر دی۔ یہ چارج پنجم کی جوبلی کا سال تھا اور اس جشن کے موقع پر برطانوی سامراج نے ایام عزا کی پرواہ کیے بغیر لکھنؤ کے امام بارگاہ میں چراغاں کا حکم دیا تھا۔ جب اس حکم کی تعمیل موثر مدافعت کے بغیر ہوگئی تو جوش اور جمیل مظہری جیسے شعراء نے خواب کو جذبہ

بیدار اور قوم کے ہاتھ میں تلوار دینا چاہی۔ مرثیہ میں قومی مضامین کی شمولیت پر اعتراض اسی زمانے میں عام ہوئے مگر اس کا احساس کسی کو نہ ہوا کہ یہ جدت محض ان شعرا کی جودت طبع کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک عظیم حادثے نے خود در حسین پر دستک دی۔''(۳)

ڈاکٹر سید صفدر حسین نے اپنی کتاب ''مرثیہ بعد انیس'' کے اندر جدید دور میں جدید مرثیہ سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے۔

''شہدائے کربلا کے مراثی کے حدود اور مقصد میں نمایاں انقلاب سب سے پہلے ہمیں جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری اور مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی کے یہاں ملتا ہے جو زمانے اور ملک کی بدلتی ہوئی ہواؤں سے پوری طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ اپنے ہیرو کی عظمت دکھانے کے لیے محض عقیدت مندی سے کام نہ چلے گا۔ بلکہ ان کے کارناموں کی اہمیت اور ان کی سیرت کا صحیح رخ دکھانا ضروری ہے۔ جوش کی قومی نظمیں ذاکر سے خطاب، سوگواران حسین سے خطاب وغیرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوش فضائے مرثیہ سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔''(۴)

اس سلسلے میں زاہد ہمایوں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''جوش کی مرثیہ نگاری روشنی کا ایسا مینارہ ہے جس سے اردو مرثیہ کی بہت سی شاہراہیں جگمگا اٹھی ہیں۔ انہوں نے اردو مرثیے کی تاریخ کو نئے موڑ سے آشنا کیا ہے۔ فکری موضوعات اور جدید فنی تقاضوں کو سامنے رکھ کر جوش نے مرثیہ کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔''(۵)

جدید مرثیے کے آغاز کی بابت ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی اپنی کتاب ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' میں یوں رقم

طراز ہیں۔

''لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا پانچواں دور بڑا اہم ہے اس عہد میں زیادہ تر وہ مرثیہ نگار تھے۔ جو میر انیس اور مرزا دبیر کے بنائے ہوئے راستے پر چل کر مرثیے میں جدت کے لیے کوشاں تھے اور دوسری جانب بعض ایسے مرثیہ نگار تھے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد مرثیے کو نئے دھارے پر لیے جا رہے تھے یہیں سے قدیم اور جدید مرثیے کی اصطلاح کا آغاز ہوتا ہے۔ جدید مرثیے کا آغاز لکھنؤ میں مرزا اوج کی مرثیہ نگاری سے شروع ہو چکا تھا لیکن بہت کم شعراء اس طرف متوجہ ہوئے تھے اس کے باوجود اگر ہم اس عہد کے مرثیہ نگاروں کے مرثیوں کا گہرا مطالعہ کریں تو ہم کو ایسے اشعار مل جاتے ہیں جیسے کہ دولہا صاحب عروج نے ایک مرثیے میں کہا

ظلمت کدے میں ہوں پہ تجلی پسند ہوں
میں ہوں عروج کیوں نہ ترقی پسند ہوں

لیکن اس دور میں مرثیے کے مقصد اور عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے ۱۹۱۸ء میں سب سے پہلے جوش ملیح آبادی نے مرثیے کا انداز بدل دیا۔''(۶)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جدید مرثیے کے آغاز کا مرکز بھی لکھنؤ ہے۔ یہاں قدیم مرثیے کے متوازی جدید مرثیے کی زیریں لہر کا بھی آغاز ہو چکا تھا، اور یہ بیسویں صدی کے سیاسی و اقتصادی حالات ہی تھے جنہوں نے مرثیے کا رخ اس جانب موڑ دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد جدید مرثیے کا آغاز ہو جانا بالکل فطری تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء میں آوازہ حق کے نام سے جوش کا مرثیہ سامنے آیا۔

> ''جوش نے پہلا مرثیہ 'آوازہ حق' ۱۹۱۸ء میں کہا تھا یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں زور پر تھیں، آزادی کی جنگ میں بدلتی سامراج کے خلاف انہوں نے اپنی شاعری سے بھرپور کام لیا۔ اس سلسلے میں واقعہ کربلا کے علائم اور رموز استعمال کیے۔ آزادی کی جدوجہد کو جوش نے ''تازہ کربلا'' کا نام دیا اور اس کی کامیابی کے لیے عزم حسین کی طلب کی۔ یہی وجہ ہے جوش کے مرثیوں

> میں بین سے زیادہ رزم کا عنصر نمایاں ہو گیا اور سیرت امام حسین کے بیان میں عزم و ہمت بے خوفی، شجاعت، صبر و استقلال کی تصویر سامنے آتی ہے۔"(۷)

یہاں پر یہ وضاحت ضروری ہے جس مرثیے کا ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے حوالہ دیا ہے وہ درحقیقت ۱۹۲۱ء میں چھپا تھا، اس سے پہلے اس کے چند بند جوش کی پہلی کتاب "روح ادب" میں طبع ہو چکے تھے۔ ہوسکتا ہے وہ چند بند ڈاکٹر ضمیر اختر کے مطابق ۱۹۱۸ء ہی میں جوش صاحب نے لکھے ہوں گے۔ بہرحال ڈاکٹر ہلال نقوی نے "جوش کے انقلابی مرثیے" جیسی اعلیٰ تحقیقی و تدوینی کتاب میں اس مرثیے کا سن اشاعت ۱۹۲۱ء ہی درج کیا ہے۔ میری ذاتی تحقیق کے مطابق بھی یہی درست ہے۔

ماہ نو کا جوش ملیح آبادی نمبر، اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں جوش کی مرثیہ نگاری پر اہم ترین مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ فضل امام رضوی اپنے مضمون "مراثی جوش اور تحفظ حقوق انسانی" میں جوش کے مراثی کے باب میں یوں رائے پیش کرتے ہیں۔

> "آج جبکہ حقوق انسانی کے تحفظ کے لیے "ہیومین رائٹس کمیشن" قومی اور بین الاقوامی سطح پر قائم کیے جا رہے ہیں لیکن آج سے تقریباً نصف صدی پہلے جوش نے اذہان انسانی اس اہم ترین مسئلے کی طرف متوجہ کیا تھا۔"(۸)

اسی رسالے میں سید عاشور کاظمی نے ایک مضمون بعنوان "جوش کی مرثیہ نگاری عالمی تناظر میں" میں جوش کی مرثیہ نگاری کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں:

> "جوش نے کبھی اپنا نام ترقی پسند مصنفین میں نہیں لکھوایا۔ لیکن ان کی پوری شاعری، حتیٰ مرثیے میں یہ تحریک نمایاں ہے۔ جوش نے امام حسین کو انقلاب کی قندیل اور عظمت انسانی کی تکمیل کہا ہے۔"(۹)

حوالہ جات

۱۔ بحوالہ: ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسوی صدی اور جدید مرثیہ، مکتبہ تعمیر ادب لاہور، ---، ص۱۷۴---از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

۲۔ ایضاً، ص۱۸۴---از مولانا جوہر

۳۔ کاظمی، محمد رضا، جدید اردو مرثیہ، مکتبہ ادب کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۸۸

۴۔ صفدر حسین، سید، ڈاکٹر، مرثیہ بعد انیس، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہو، ۱۹۷۱ء، ص۱۷۶

۵۔ زاہد ہمایوں، مراثی انیس کے جمالیاتی عناصر، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۲۵۶

۶۔ ضمیر اختر، نقوی، ڈاکٹر، اردو مرثیہ پاکستان میں، مرکز علوم اسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۶ء، س۹۸

۷۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۸۔ رضوی، فضل امام، مراثی جوش اور تحفظ حقوق انسانی، مشمولہ: ماہ نو، جوش ملیح آبادی نمبر، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۱

۹۔ عاشور کاظمی، سید، جوش کی مرثیہ نگاری عالمی تناظر میں، مشمولہ: ماہ نو، جوش ملیح آبادی نمبر، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۰۱

H25596

باب سوم:
جوش کی مرثیہ نگاری

جوش ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری کم وبیش پچاس سالوں پر محیط ہے۔ انہوں نے اس دوران میں ۹ مرثیے تخلیق کیے۔ ان کی مرثیہ گوئی کا آغاز متحدہ ہندوستان کے وقت ہوا تھا بعد میں برصغیر پاک و ہند کی شکل میں دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ تقسیم سے پہلے سیاسی وسماجی حالات مختلف تھے کیونکہ ہندو اور مسلمان انگریز سامراج سے چھٹکارا پانے کے لیے جدوجہد میں مصروف تھے تقسیم کے بعد سیاسی حالات کی نوعیت بدل گئی۔ دونوں پس منظر سمجھنے کے لیے سہولت کی خاطر جوش کی مرثیہ نگاری کو دو ادوار میں تقسیم کرنا لازم ٹھہرتا ہے۔

ا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی مرثیہ نگاری

ب۔ ۱۹۴۷ کے بعد کی مرثیہ نگاری

جوش کے ۹ مرثیوں کی سن تصنیف کے اعتبار سے ترتیب مندرجہ ذیل ہے۔

ا۔ آوازۂ حق، ۱۹۲۰ء

۲۔ حسین اور انقلاب، ۱۹۴۱ء

۳۔ موجد و مفکر، ۱۹۵۷ء

۴۔ آگ، ۱۹۵۹ء

۵۔ وحدت انسانی، ۱۹۶۰ء

۶۔ عظمت انسان، ۶۳۔۱۹۶۲ء

۷۔ موت محمد و آلِ محمد کی نظر میں، ۱۹۶۵ء

۸۔ ارتقائے خاک، ۱۹۶۷ء

۹۔ پانی، ۱۹۷۱ء

مندرجہ بالا ترتیب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو جوش ملیح آبادی نے تقسیم ہند سے پہلے صرف دو مرثیے

لکھے تھے لیکن اس کا ہرگز مطلب نہیں کہ رثائی خدمات میں جوش نے اس دوران میں صرف یہی مرثیے کہے ہیں بلکہ سلام، رباعیات اور دیگر کئی ایک رثائی نظمیں بھی زیورطبع سے آراستہ ہوچکی تھیں، ان کا ذکر جوش کی رثائی خدمات والے باب میں الگ سے کیا جائیگا۔ چنانچہ اس حصے میں ان کے دو مرثیوں ''آوازحق'' اور ''حسین اور انقلاب'' تک بحث محدود رہے گی۔

الف: ۱۹۴۷ء سے پہلے کی مرثیہ نگاری:

جوش کی مرثیہ نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہ مرثیے کچھ ادبی حلقوں میں مرثیے کے بجائے ''مسدس'' سمجھے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ''آوازہ حق'' کو چھوڑ کر باقی تمام مرثیوں میں قدیم مرثیہ کے عناصر کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں جب ''آوازحق'' چھپا تو اس پر ۱۹۲۲ء مولوی عبدالحق نے یہ تبصرہ کیا تھا۔

> ''یہ آوازحق ان کی جدید نظم ہے جس میں مرثیے کی طرز پر واقعہ شہادت کربلا کو نظم کیا گیا ہے۔ کل ۹۲ بند ہیں۔ مضمون وہی ہے جو اکثر مرثیوں میں پایا جاتا ہے طرز بھی وہی ہے، البتہ اتنی جدت کی ہے کہ آخر کے تین چار بندوں میں اس حادثہ پر الم کو حال کے مصیبت ناک معاملات سے مطابق کیا ہے اور اخلاقی پہلو نکالا ہے۔
>
> افسوس ہے کہ اب تک کسی نے حادثہ کربلا سے جو حق پرستی اور ایثار کی اعلیٰ اور بے نظیر مثال ہے، صحیح طور پر کام نہیں لیا۔'' (۱)

ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے اس سلسلے میں لکھا تھا:

''بعض حضرات نے جوش کے مرثیوں کو محض مسدس کا نام دیا ہے، مگر یہ ایک تنگ خیالی ہے۔ چونکہ میر ضمیر سے منسوب کردہ ترتیب سے الگ ہونے کے باوجود انہوں نے مرثیہ کو ایک ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ فکری عنصر کی شمولیت سے ترتیب کو وسعت دی ہے۔ 'موجد و مفکر' اور 'عظمت انسان' (قلم) نامی مراثی میں انہوں نے ابواب مقرر کر کے ایک جدید راہ نکالی ہے اور اس کے علاوہ جوش کے مرثیے مقصد شہادت کے قریب تر ہیں، اس

لیے انہیں مرثیہ نہ کہنا ایک ناانصافی ہے۔ جوش نے اردو مرثیے کی تاریخ کو نئے موڑ سے آشنا کیا ہے۔ موجودہ صدی میں جوش واحد شاعر ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اردو شاعری میں 'جدید مرثیہ' کے باب کا اضافہ کیا ہے۔''(۲)

ظاہر ہے یہ بحث جوش ملیح آبادی کی زندگی میں ہی چھڑ گئی تھی کہ انہیں مسدس کہا جائے، طویل نظم کا نام دیا جائے یا پھر ''جدید مرثیے'' کے ذیل میں رکھا جائے۔ ضروری ہے کہ خود جوش صاحب کی رائے کو دیکھا جائے کہ وہ اس باب میں کیا کہتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ہلال نقوی کو ایک خط میں جوش صاحب لکھتے ہیں۔

> ''میں نے اس پر کبھی اصرار نہیں کیا کہ میرے مسدسوں کو مرثیہ کہا جائے۔ مجھے اس سے سروکار نہیں کہ آپ انہیں مرثیے کا نام دیں یا نہ دیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے پیش نظر اس قسم کے مسدس میں لکھتے وقت مرثیے ہی کا تصور رہتا ہے، میرا موضوع ان مرثیوں میں جب کربلا، حسینیت، عزم شہیدانِ کربلا، بے باکی اور حق گوئی ہوتا ہے تو پھر نقادوں کی رٹ کہ جوش کے مسدس جدید مرثیے نہیں ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتی۔''(۳)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے محولہ بالا رائے کو مزید واضح کرنے کے لیے اسے ایک اور قرینے سے بھی دیکھا ہے، چنانچہ وہ اس خط کے بعد لکھتے ہیں:

> ''یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ جوش نے ان مرثیوں کو امام بارگاہ میں، مجلس میں یا کسی مجلسی نشست ہی میں پڑھا ہے، ان مرثیوں کے چہرے انہوں نے الگ ضرور شائع کیے ہیں لیکن چہروں کو کسی مشاعرے میں یا کسی نجی نشست میں کبھی نہیں پرھا۔ اپنے عہد میں جوش اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ان کے مرثیے میں بینیہ و بکائیہ اظہار کے متعلق سامعین میں بھی اور بعض نقادوں میں بھی ایک تنقیدی اضطراب ہے۔''(۴)

ماہرین فن کے نزدیک یہ بحث ابھی تک جاری ہے اور شاید کافی دیر بعد تک بھی جاری رہے گی، کیونکہ کسی بھی صنف ادب میں نئے تجربات کو شروع میں اس طرح کے اختلافات کا سامنا کرنا پڑتا ہے بعد میں نئے تجربات رجحان یا تحریک کا موجب بن جاتے ہیں۔ جوش کی رثائی خدمات پر کام کرتے ہوئے ان کے اپنے بیانات کی حیثیت مسلم ہے۔ لہٰذا ہم ذاتی طور پر ان مسدسوں کو ''جدید مرثیے'' ہی سمجھتے ہیں۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو مرثیے کا تعلق اس کی ہیئت یا اجزاء کی ترتیب کے بجائے موضوع سے ہے، اور جوش کے مرثیوں کا موضوع کربلا اور حسینؑ ہی ہے۔

آوازۂ حق

یہ جوش کا سب سے پہلا مرثیہ ہے، اس مرثیے میں جوش نے اپنے مخصوص اسلوب کے ذریعے قدیم مرثیہ کی اجزائی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ قدیم مرثیے کے تمام اجزاء جو کہ میر ضمیر کے دور سے چلے آ رہے تھے، ان کی پابندی کی ہے۔ اس میں چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ شہادت اور بین سبھی کچھ موجود ہے۔ اس کے چہرہ کے بند ''روحِ ادب'' میں بھی چھپے تھے اور فٹ نوٹ پر ہلال نقوی کے بیان کے مطابق یہ وضاحت کی تھی کہ مرثیہ نو تصنیف کا چہرہ ہے۔ ''آوازۂ حق'' کا چہرہ بڑی جلالی شان کا حامل ہے، جو کہ جوش کے بلند بانگ لہجے کا سرتاپا گواہ ہے۔ اس مرثیے کا اکیسواں بند ملاحظہ ہو۔

اس راہ مہمات میں آ، گر ہے جواں مرد
یہ راہ ہے جس میں نہیں اڑتی ہے کبھی گرد
چہرے کبھی اس راہ میں ہوتے ہی نہیں زرد
پھولوں کی مہک آتی ہے چلتی ہے ہوا سرد
دنیا ہے یہ وہ جس میں فلک ہے نہ زمیں ہے
ذرے میں یہاں وہ ہے جو سورج میں نہیں ہے (۵)

ایک طرف راہ مہمات میں جوانوں کو آنے کی دعوت دی جا رہی ہے اور دوسری طرف انہیں یہ بھی باور کرایا جا رہا ہے کہ عزم و ہمت کے میدان میں سورج بھی ذرے کے برابر نہیں۔ تاریخ کے اوراق الٹتے ہوئے جوش کا شوق انہیں بڑے بہادروں کی فہرست دکھلاتا ہے۔ جس میں حسین ابن علیؓ کا نام سنہری حروف میں لکھا ہوا تھا۔

اک روز ہوا شوق مرے دل میں یہ پیدا
اس راہ سے گزرے ہیں جو نام آور و یکتا
حالات بھی کچھ ان کے میں دیکھوں کہ وہ تھے کیا
اس شوق میں تاریخ کے اوراق کو الٹا
فہرست میں اک نام تھا جو سب سے جلی تھا
مژدہ ہو کہ وہ نام حسین ابن علی تھا (۶)

آگے چل کر اسی مرثیہ کے باسٹھویں بند میں جنگ کے میدان میں شاعر نے امام حسینؓ کا دشمنوں پر ہیبت طاری کر دینے والا ایک نقشہ کھینچا ہے، ملاحظہ ہو:

مولا کا مزاج اتنا جو برہم نظر آیا
لشکر پہ عجب خوف کا عالم نظر آیا
سامانِ جفا درہم و برہم نظر آیا
کی جس سر خیرہ پہ نظر خم نظر آتا
خاموش صفیں یاس کے عالم میں کھڑی تھیں
مردہ تھیں نگاہیں کہ زمینوں میں گڑی تھیں

شیر بہادر امام حسینؑ کی جنگ کا ایک اور منظر جوش نے بڑی خوبصورتی سے دکھایا:

جس سمت جھپٹتا تھا وہ شیر صف جنگاہ
گر گر کے فنا ہوتے تھے گھوڑوں سے وہ بدخواہ
کفار میں تھا شور کہ العظمۃ للّٰہ
آتے بھی ہیں شیروں کے مقابل کہیں روباہ
ترتیب صفوں میں تھی نہ وہ شان پروں کی
برسات کا طوفان تھا بارش تھی سروں کی (۷)

امام حسینؑ کو جوش نے ظالم دشمنوں کے نرغے میں گھرا ہوا کوئی مسکین، عاجز یا کم حوصلہ فرد ظاہر نہیں کیا بلکہ امام کے کردار بلندی کا پاس ولحاظ ملحوظ رکھتے ہوئے دشمن پہ چھایا ہوا دکھایا ہے، امام حسینؑ کا یہ کارنامہ رہتی دنیا کے حریت پسندوں کے لیے مشعل راہ ہے کہ بے شک جان چلی جائے، ظالم، جابر اور متکبر حکمران کی بیعت نہ کی جائے۔

اگرچہ یہ مرثیہ قدیم طرز کے مرثیوں کی طرح ہے لیکن اس کا اختتام قدیم مرثیے سے بالکل مختلف ہے، قدیم مرثیے کا اختتام عموماً دعا اور مناجات پہ ہوتا ہے، مگر اس کے آخری بند میں جوش اپنی قوم سے مخاطب ہو کر اسے کردار حسینی اپنانے کی دعوت دیتے ہیں۔

اے قوم! وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ
اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ
تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ

مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو

لازم ہے کہ ہر فرد حسین ابن علی ہو (۸)

اس مرثیے کی فارم وہی ہے جو سودؔا کے عہد سے مرثیے کے لیے مخصوص ہوچکی تھی۔ اس سلسلے میں جوش کا نظریہ پہلے باب میں دیا جاچکا ہے، ہلال نقوی کو انٹرویو دیتے ہوئے جوش نے کہا تھا۔

''فارم میں تبدیلی لانا کوئی ضروری نہیں ہے۔ مسدس میں چھے مصرعے ہوتے ہیں، جن میں موسیقیت بھی ہوتی ہے اور گنجائش بھی۔ اثر اور جوش دونوں باتیں اس سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے مسدس مرثیے کے لیے بہترین شکل ہے۔''(۹)

''آوازۂ حق'' کو پڑھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جوش مرثیے کے ذریعے محض رونے رلانے کا کام نہیں کرنا چاہتے، بلکہ اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ اس صنف کو صرف مجلسی ضرورت کے لیے اختیار نہیں کر رہے تھے کیونکہ وہ کوئی باقاعدہ ذاکر، واعظ یا خطیب تو تھے نہیں، وہ تو صرف قوم کو محکومی و غلامی کا احساس دلا کر اسے بیدار کرنے کے لیے مرثیہ لکھ رہے تھے، آوازہ حق کا آخری حصہ اس لحاظ سے خصوصی طور پر دیکھا جاسکتا ہے، آخری بند تو اس دور سے ہی زبان زدعام چلا آ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوش کے نظریات کو سامنے رکھ دیکھا جائے یہ مرثیہ بنیادی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین ''آوازہ حق'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

'''' آوازۂ حق' کے نام سے جوان کا مرثیہ شائع ہوا تھا وہ پہلا مرثیہ ہے جس میں امام کے کارنامہ کو صحیح صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسے پڑھ کر حسین کی شہرت یعنی شجاعت اور صبر و ایثار کی صحیح انسانی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔''(۱۰)

جب 'آوازۂ حق' پہلی دفعہ چھپا تو اس وقت جوش نے اس وقت کچھ تحریریں بھی شائع کی تھیں۔ ہلال نقوی نے اپنی تحقیقی و تدوینی کتاب میں ڈھونڈ کر وہ تحریریں شامل کر دیں ہیں، ان میں سے ایک کا آخری

پیراگراف یہ تھا۔

''اس سے اے برادرانِ ملک تم سبق حاصل کر سکتے ہو، باطل خواہ کتنی ہی قوت سے رونما کیوں نہ ہو، پھر باطل ہے اور اگر تم حق پرست ہو تو اس خود فراموش کی بات یاد رکھنا کہ آخر کار ایک دن فتح کا تاج تمہارے ہی سروں پر سج کر رہے گا۔'' (۱۱)

حسین اور انقلاب

''آوازہ حق'' کے تقریباً ۲۰ سال بعد ۱۹۴۱ء میں یہ معرکتہ الآراء مرثیہ منظر عام پر آیا۔ اس مرثیہ کے ۶۸ بند ہیں یہی وہ پہلا مرثیہ ہے جس میں جوش مکمل طور پر قدیم مرثیے سے انحراف کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور پوری انقلابی روح اس میں سمو دیتا ہے۔ جنگ عظیم دوم کا زمانہ ہے ملکی سیاست عروج پر ہے، انگریزی راج برابر قائم ہے حقوق کی بازیابی تحریکیں چل رہی ہیں، خود مختاری کی بات ہو رہی اور آزادی کے نعرے گونج رہے ہیں۔ اس فضا میں جوش جیسے پر جوش، متحرک اور لاابالی طبیعت کے مالک شاعر سے پرانے مرثیے کی توقع عبث تھی، چنانچہ ''حسین اور انقلاب'' جیسا انقلابی مرثیہ جب لاتعداد مجمع کے سامنے لکھنؤ کی امام بارگاہ میں جب پڑھا گیا تو ہر طرف جوش کے اس مرثیے کی دھوم مچ گئی۔ یادوں کی بارات میں اس مجلس کا حال جوش یوں بیان کیا ہے۔

''حسین اور انقلاب' سننے کے لیے پورا ادبی لکھنؤ ٹوٹ پڑا تھا۔ امام باڑے میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہ تھی۔ لکھنؤ کے تمام شعراء تمام اساتذہ یہانتک کہ مولانا صفی بھی تشریف لائے، اور اس مجلس میں فقط شیعہ ہی نہیں اہل سنت اور ہندو بھی شریک ہوئے تھے، چونکہ اس مسدس میں آہ و فغاں پر زور دینے کے بجائے ایثار اور کردار حسین پر عمل کرنے کی پہلی بار ترغیب دی گئی تھی، اس لیے ارباب مجلس نے بالعموم اور اعیان سیاست نے بالخصوص بار بار کھڑے ہو کر اس جوش و خروش سے داد دی تھی کہ ان کی آوازوں کے تھپڑوں سے منبر میں جنبش پیدا ہوگئی تھی۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سامعین اپنے گریبان پھاڑ کر میدان جنگ میں کود پڑیں

گے۔''(۱۲)

یہ مرثیہ لکھنؤ میں آغائی صاحب کے امام باڑے میں جب پڑھا گیا، مولانا مرتضٰی حسین لکھنوی بھی مجلس میں موجود تھے۔ مولانا موصوف ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر ہلال نقوی کو ایک خط میں اس مجلس کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجلس میں جوانوں اور دانشوروں کا بہت بڑا مجمع تھا روایتی شرکائے مجالس نئے سامعین سے کم تھے، جوش صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں مسدس پڑھا اور مجمع میں لوگوں نے نیم قدم اٹھ اٹھ کر داد دی، ایک ایک بند کئی مرتبہ پڑھوایا، مصرعوں پر بے حد داد ملی عموماً بیت بیت پر مجمع تڑپا، مجلس میں وقفے وقفے سے گریہ بھی ہوا اور شور واہ واہ تو ہوتا ہی گیا۔''(۱۳)

اس انقلابی مرثیے کی گونج اب تک ادبی حلقوں میں سنائی دیتی ہے۔ تقسیم سے پہلے برصغیر کے سیاسی پس منظر میں اس کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ شب عاشور کا منظر ذہن میں رکھتے ہوئے جوش نے امام کا اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ مکالمہ پیش کیا ہے، ملاحظہ کریں۔

وہ رات جب امام کی گونجی تھی یہ صدا
اے دوستانِ صادق و یارانِ با صفا
باقی نہیں رہا ہے کوئی اور مرحلا
اب سامنا ہے موت اور صرف موت کا
آتے ہی پر بلائیں ہیں اب تحت و فوق سے
جانا جو چاہتا ہے چلا جائے شوق سے(۱۴)

اس بات کے جواب میں بہادر، نڈر، مجاہدوں کا جواب بھی سنیے:

اور سنتے ہی یہ بات ، بصد کرب و اضطراب
شبیر کو دیا تھا یہ انصار نے جواب
''دیکھیں جو ہم یہ خواب بھی'' اے ابن بوتراب
واللّٰہ فرطِ شرم سے ہو جائیں آب آب
قرباں نہ ہو جو، آپ سے والا صفات پر
لعنت اس امن وعیش پہ تف اس حیات پر

اس بند سے اگلے بند کا گرہ والا بیت تو ایسا بیت ہے جس میں امام حسین کے ساتھیوں کا حقیقی نقشہ، جوش نے ہمارے سامنے رکھ دیا ہے، اصحاب حسین گویا ہوتے ہیں:

ے پتلے ہیں ہم حدید کے پیکر ہیں سنگ کے
انساں نہیں پہاڑ ہیں میدانِ جنگ کے(۱۵)

جدید مرثیہ کی تعریف کے سلسلے میں ہلال نقوی کو انٹرویو دیتے ہوئے جوش نے کہا تھا:

''جو مرثیہ تاسیٔ حسین پر ابھارے وہ جدید ہے اور وہ مرثیہ جو تاسیٔ حسین پر نہ ابھارے چاہے اس جدید عہد میں لکھا جائے لیکن وہ قدیم مرثیہ ہی کہلائے گا۔''(۱۶)

یہ پورا مرثیہ تاسیٔ حسین پر ابھارنے کی کامیاب کوشش ہے حسین کے ساتھیوں کا ولولہ، امام کا جوش حریت دیکھ رگوں میں لہو جوش مارنے لگتا ہے۔

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بہ دم!!
دشت ثبات و عزم ہے، دشت بلا و غم

صبر مسیح و جرات سقراط کی قسم
اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتش بدروحنین ہے
جس سورما کا اسم گرامی حسین ہے

جو صاحب مزاج نبوت تھا وہ حسین
جو وارث ضمیر رسالت تھا وہ حسین
جو خلوتی شاہد قدرت تھا وہ حسین
جس کا وجود فخر مشت تھا وہ حسین
سانچے میں ڈھالنے کے لیے کائنات کو
جو تولتا تھا نوک مژہ پر حیات کو(۱۷)

ایک اور بند کا اگلا بیت ملاحظہ ہو:

ے جس کی نظر پہ شیوہ حق کا مدار تھا
جو روح انقلاب کا پروردگار تھا

کردار حسین کو واضح کر کے ہی ملک و ملت کو بے دار کیا جا سکتا تھا، عزم حسین کی مثال پیش کر کے ہی محکوموں کے آزادی کا احساس جگایا جا سکتا تھا، چنانچہ جوش نے اس میدان میں پورا زور قلم صرف کیا ہے۔

طاقت سی شے کو خاک میں جس نے ملا دیا
تختہ الٹ کے، قصرِ حکومت کو ڈھا دیا

جس نے ہوا پہ رعب امارت اڑا دیا
ٹھوکر سے جس نے افسر شاہی گرا دیا
اس طرح جس سے ظلم سیہ فام ہوگیا
لفظِ یذید، داخلِ دشنام ہوگیا(۱۸)

جس کی جبیں پہ کج ہے خود اپنے لہو کا تاج
جو مرگ و زندگی کا ہے ایک طرفہ امتزاج
سر دے دیا، مگر نہ دیا ظلم کو خراج
جس کے لہو نے رکھ لی تمام انبیاؑء کی لاج
سنتا نہ کوئی دہر میں صدق و صفا کی بات
جس مرد سرفروش نے رکھ لی خدا کی بات(۱۹)

جوش نے جدید مرثیے کا جو تصور پیش کیا تھا، اس کی اپنی شاعری، بھلے دنیا اسے مرثیہ کہے یا مسدس اس پر پوری اترتی ہے۔ وہ گھوڑے اور تلوار کے بیان میں تخیل کے گھوڑے دوڑانے کو تضیع اوقات گردانتے ہیں۔ اسی لیے وہ سارا زورِ قلم فکری و انقلابی توانائی پر لگاتے ہیں۔

ے رنگ اڑ گیا حکومتِ بدعت شعار کا
عزم حسین، عزم تھا پروردگار کا

غازہ ہے تیرا خون رخ کائنات کا

ہر قطرہ 'کوہِ نور' ہے تاج حیات کا (۲۰)

مرثیہ میں آہ و بکا اور گریہ کے بارے میں جوش نے کہا تھا:

''ایک زمانے میں بکا پر ختم ہونے والے مرثیے محبان اہلبیت کے لیے ایک سیاسی حربہ تھے۔ بنی امیہ کے ہاتھ میں طاقت آ گئی تھی اور عاشقان آل محمد کے پاس کچھ نہیں رہا تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے آنسوؤں سے بنی امیہ کے تخت و تاج کو بہا دیا۔'' (۲۱)

''حسین و انقلاب'' میں بھی جوش نے بین، گریہ اور بکا کا اہتمام نہیں کیا، بلکہ اپنے محکومانہ، غلامانہ برصغیر کے سیاسی حالات کو سامنے رکھ کر امام حسین، جو کہ حریت کے پیکر عزم کے پہاڑ ہیں، کی خدمت میں یہ عرض گزاری کی ہے۔

پھر حق ہے آفتاب لب بام، اے حسین

پھر بزم آب و گل میں ہے کہرام اے حسین

پھر زندگی ہے ست و سب گام اے حسین

پھر حریت ہے مورد الزام اے حسین

ذوق فساد و ولولہ شر لیے ہوئے

پھر عصر نو کے شمر ہیں خنجر لیے ہوئے

''حسین اور انقلاب'' جب منظر عام پر اس بڑے بڑے ادیبوں نے اسے سراہا، جوش کو داد دی اور اس مرثیہ کو وقت کا تقاضا قرار دیا، اس سلسلے میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، پروفیسر ممتاز حسین اور سبط حسن کی آراء کو یکجا کیا ہے۔

''۔۔۔حضرت امام علیہ السلام کے صحیح پیام کو پیش کرنے کی کوشش کی بلکہ اردو مرثیے کو اصلاحی انداز میں پیش کیا ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین راقم ہیں کہ۔۔۔اس مرثیے کے ساتھ جوش کے بیان میں ایک نئی قوت اور توانائی پیدا ہوئی اور انہوں نے جس عمومیت اور آفاقیت کے ساتھ واقعہ کربلا کو پیش کیا اس سے ان کی گہری انسان دوستی کا پتا چلتا ہے۔

سبط حسین کی تجزیاتی رائے کو ہلال نقوی نے اپنی کتاب میں یوں جگہ دی ہے۔

مرثیہ گویوں کے جذبات و احساسات کا محور سانحہ کربلا تھا اور واحد مقصد غم حسین کی یاد تازہ کر کے عزاداران حسین کو رلانا، اس عظیم قربانی کا فعالی کردار ان کی نظروں سے پوشیدہ تھا حق و باطل کی یہ جنگ ان کی نظر میں ایک المیہ تو تھی مگر وہ اس کا رشتہ اپنے عہد سے جوڑنے سے قاصر تھے۔ یہ تاریخی کارنامہ جوش ملیح آبادی نے سرانجام دیا۔ ان کے فلسفہ شہادت میں گریہ و ماتم کی حیثیت ثانوی ہے، ان کی فکر میں خلافت یذید سے انکار اور کربلا کا حادثہ کوئی وقتی واقعہ نہیں، بلکہ راہ حق میں جہاد کی ایک ابدی للکار ہے جو حسینیوں کو ہر دور اور ہر عہد میں باطل قوتوں سے نبرد آزمائی کی دعوت دیتی ہے۔''(۲۲)

ب: ۱۹۴۷ء کے بعد کی مرثیہ نگاری

یوں تو تقسیم ہند سے پہلے جوش نے صرف دو مرثیے تخلیق کیے تھے، اس دوران میں رثائی خدمات میں فقط یہی دو مرثیے نہیں، کچھ اہم نظمیں، سلام اور رباعیات وغیرہ بھی ہیں جنہیں ایک الگ باب میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ تقسیم سے پہلے سیاسی حالات اور مجموعی طور پر سماجی صورتحال کی نوعیت مختلف تھی۔ اس کی واضح جھلک ہمیں ''آواز حق'' اور ''حسین اور انقلاب'' میں دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان جب تقسیم ہوگیا، حالات و واقعات اور کے اور ہوئے تو جوش کی مرثیہ نگاری کے تیور بھی بدلنے لگے۔ اس عہد کی مرثیہ نگاری میں اگر چہ جوش کا ہیرو

تو ''امام حسین'' ہی ہے، کربلا ایک قربانی ،عزم وہمت کے استعارہ کے طور پر مستقلاً جوش کی فکر کا محور ومرکز رہا۔ لیکن تقسیم کے بعد کی مرثیہ نگاری میں مضامین کی نوعیت ہمہ گیریت وآفاقیت میں بدل جاتی ہے۔

۱۹۵۶ء میں جوش باقاعدہ پاکستان کے شہری بن چکے تھے، ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۶ء تک کا دور جوش کی مجموعی شاعری کا چوتھا دور تھا۔ پاکستان میں آمد کے پہلے سال ہی ''موجد ومفکر'' جیسا منفرد مرثیہ کہا۔ منفرد اس اعتبار سے کہ جوش نے اسے چھے پاروں میں تقسیم کیا، ابتدائی ۳۹ بندوں میں بعض مصرعوں میں کچھ ذیلی سرخیاں بھی قائم کی ہے۔ ہلال نقوی کے مرتب کردہ مرثیوں والی کتاب میں یہ سرخیاں کچھ اس طرح درج ہیں۔

> ''ابتدائے تمدن و آغاز بیاں۔ گھڑی کی ایجاد۔ صنعت و سائنس۔ ریفریجریٹر۔ فلکیات۔ ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن۔ ٹیلیگراف۔ طیارے۔ علم طبقات الارض۔ چٹانوں کی پرتیں۔ ذوق جمالیات۔ جمالیاتی شعور کی بیداری۔ صنعت کیمیائی۔اسپوتنک طبعی آلات۔ ایکسرے۔ ایئرکنڈیشننگ۔ ارباب حکمت و ہدایت تقابل موجد ومفکر۔قوت فکر۔'' (۲۳)

مرثیے کے ذریعے جوش دراصل قوم کے ہوش ٹھکانے میں لانا چاہتے ہیں انسانی تہذیب وتمدن کے مختلف مراحل وارتقا کی نشان دہی کر کے موجودہ حالات میں بہتری لانے کی جوش سبیل نکالنا چاہتے ہیں۔ مرثیہ گوئی کے لیے علیت والے سوال میں حضرت جوش نے ڈاکٹر ہلال نقوی کو یہ جواب دیا تھا۔

> ''دورِحیات جس قدر اجازت دے (مرثیہ گو) ہر علم سے کچھ نہ کچھ ہنر یاب ضرور ہو۔'' (۲۴)

اس مرثیے میں جوش اپنی اسی فکر پر پورا اترتے ہیں۔ ظاہر ہے جوش کو احساس تھا کہ وہ قدیم مرثیے کے بجائے جدید مرچیہ کہہ رہے ہیں لہٰذا قدیم مرثیے کی اجزائی ترکیب کے بجائے اپنے مرثیے کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر رہے تھے۔ چونکہ وہ بات کو تفصیل سے بیان کرنا چاہ رہے تھے، لہٰذا اس کے لیے انہوں نے بحر بھی کھلے دامن والی اختیار کی، واضح رہے کہ اس مرثیے کی بحر ہمیں کلاسیکل مرثیے میں نہ ہونے کے برابر

دکھائی دیتی ہے۔ بحروں کے انتخاب کے سلسلے میں جوش کی رائے کا درج کرنا بہت ضروری ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

''ہر خیال اپنے ساتھ بحر لاتا ہے۔ بحر درحقیقت خیال کا انتخاب ہوتا ہے نہ کہ شاعر کا۔''

اس مرثیے میں موضوعات کی جو متنوع بہار ہے اس کو ہلال نقوی نے اس انداز سے بیان کیا ہے۔

''مرثیے میں موضوعات کی یہ لہر ایک طرح سے انسانی عظمت کے اعتراف ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مرثیوں پر ابتدا سے آخر تک وہ تصور فکر حاوی نظر آتا ہے جو ان کی فکر کی بنیاد بھی ہے، اسکی روح بھی اور اس کا تدریجی عمل بھی یعنی عظمت انسان کا اقرار۔''(۲۵)

اس مرثیے کا پہلا بند کچھ یوں ہے:

مسکرا کر جب ہوئی طالع تمدن کی سحر
جنگلوں سے شہر کی جانب مڑی فکر بشر
رسمسائی آرزوئے بام، چونکا ذوق در
کشت خاک تار میں اگنے لگے شمس و قمر
خوشۂ حسن زمیں، یوں ناز سے پکنے لگا
داب کر دانتوں میں انگلی آسماں تکنے لگا(۲۶)

بند نمبر ۳۹ بھی دیکھیں

آسمان زندگی پر ذہن تاباں کا ہلال
مصر کے بازار میں جس طرح یوسف کا جمال

عقل اگر گل ہو تو شمع کشتہ ہے ماضی و حال

دارو و درماں سے مردوں کو جلانا اور ہے

زندہ انسانوں کو قبروں سے اٹھانا اور ہے(۲۷)

انسان کو بے دار کرنا ہی جوش کا مطع نظر ہے اسی لیے وہ زندہ انسان کو قبروں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ایسا نہیں کہ حیاتیاتی طور پر وہ لوگ مر چکے ہیں، اس لحاظ سے تو وہ زندہ ہیں کھاتے پیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، مگر عملی طور پر وہ مردہ ہو چکے ہیں ان کے اندر سے انسانی روح نکل چکی ہے، اس چیز کا وہ بار بار انہیں احساس دلاتے ہیں اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں اور ہر بار ان کو اپنے ہیرو امام حسینؑ سے رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔امام عالی مقام کی عظمت جوش کے نزدیک اس لیے نہیں کہ وہ پیغمبر اکرم کی لخت جگر کے لخت جگر ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ امام کے عمل میں حرکت ہے، جوش ہے حریت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ باطل سے ٹکرا جانے کا حوصلہ ہے۔

اس بنا پر جوش اس مرثیے میں امام حسین کو کبھی مرد جلیل، قبلہ عالم، امام عصر، فخر اسماعیل و جان مصطفیٰ اور ناز خلیل جیسے القابات سے پکارتا ہے تو کبھی وہ محور گیتی و گردوں اور مرکز دین و دنیا قرار دیتا ہے۔

۱۱۷ بندوں پر مشتمل ''موجد و مفکر'' میں یوں تو کربلا کے دیگر کرداروں کا بھی تذکرہ ملتا ہے لیکن یہ برسبیل تذکرہ کی حد تک ہی رہتا ہے، کیونکہ امام کی عظیم شخصیت کے اندر ہی یہ کردار چھپے ہوئے ہیں۔اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیگر مرثیہ گویوں کی طرح جوش نے کردار نگاری میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔وہ بار بار امام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور محبان حسینؑ کو بھی اسی کردار کی طرف دیکھنے کی یوں دعوت دیتے ہیں۔

کچھ خبر بھی ہے محبان اس دور میں

موت ہے شبیریت کے دائرے میں انگبیں

اتباع مرشد حق پر ور و عہد آفریں

کاروبار مرگ ہے، بازیچہ طفلاں نہیں
زہر سے لبریز ہے جام حسین ابن علی
جان دینا ہو تو لو نام حسین ابن علی

عزت دستور پر جو سر کٹا سکتا نہیں
تان کر سینے کو جو میداں میں آسکتا نہیں
جو خود اپنے ہی چراغوں کو بجھا سکتا نہیں
موت کو جو اپنے کاندھے پر اٹھا سکتا نہیں
ہاں خود اپنے خون میں کشتی جو کھے سکتا نہیں
وہ حسین ابن علی کا نام لے سکتا نہیں(۲۸)

اسی مرثیہ کا پارہ پنجم کو مزید تین ذیلی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پارہ پنجم اور ششم امام حسین کی حریت پسند، بیدار فطرت اور انا پسندی زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

دو سال بعد ''آگ'' لکھا گیا، یہ مرثیہ قدرے مختصر ہے اس کے صرف ۳۰ بند ہیں۔ اس کے بقیہ بند ابھی تک مل نہیں سکے۔ یہ مرثیہ جوش کی کتاب ''محراب و منبر'' میں بھی موجود ہے، لیکن اس کے ۲۵ بند شامل تھے، ہلال نقوی کی تحقیق سے اب تک ۳۰ بند سامنے آسکے ہیں۔ ''آگ'' کو جوش نے وسیع تر مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

آگ، غوغائے عزازیل و قوائے جبرئیل
قصر دوزخ میں بھیانک ، قصر جنت میں جمیل

گاہ قہر باد صر صر، گاہ نہر سلسبیل
غیظ میں نمرود، وقت ناز گلزار خلیل
جنگ کے میداں میں گرز گراں تولے ہوئے
صلح کے ایوان میں گھونگھٹ کے پٹ کھولے ہوئے

''آگ'' کو جوش، طاقت، جذبے اور بیداری کی علامت کے طور پر ہم دیکھ سکتے ہیں۔ جوش کے رثائی افکار کی بنیادی روح اس سے آشکار ہوتی ہے۔لیکن یہ طاقت، یہ جذبے پھر بھی ہمیں کسی اخلاق کے تابع دکھائی دیتے ہیں، وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ طاقت کا اندھا دھند استعمال سراسر جبر واستبداداور اس کے تمام سامراجی مظاہر کے خلاف سیف وقلم وقرطاس سے برسرِپیکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ''آگ'' کو قصر دوزخ میں بھیانک تو قصر جنت میں جمیل کہتے ہیں۔ بادصرصر کا قہر کہتے ہوئے وہ آگ کو نہر سلسبیل کہنا بھی نہیں بھولتے، جہاں وہ غلیظ نمردو کہتے ہیں، وہیں گلزار خلیل کا ناز بھی کہتے ہیں۔

وحدت انسانی

پچھتر بندوں پر مشتمل ایک اہم مرثیہ ہے۔ وحدت انسانی پر یقین جوش کی اساسی فکر ہے۔ یہ فکر ان کی پوری شاعری میں جاری و ساری ہے۔ ایک الگ مرثیے کے طور پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اس مرثیے کا پہلا بند تو اردو شاعری میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا

پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

اس مرثیے میں بھی جوش اپنے رثائی نظریے کے مطابق بین اور بکا کا اہتمام نہیں کرتے، ان کا بنیادی محرک یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑا جائے، اس کے احساس میں ارتعاش پیدا کیا جائے۔ ایک خاص قسم کی بیداری ہمیشہ ان کے مرثیہ کا محور و مرکز رہی ہے۔ وہ انسان کو ایک نوع کے طور پر دیکھتے ہیں، طبقات میں یا نظریاتی و جغرافیائی گروہوں میں انسان کو تقسیم کرنا، ان کا شیوہ نہیں۔ بلکہ اس کے وہ سخت خلاف ہیں۔ امام حسین کی صورت میں انہیں ایک ایسا مسیحا نظر آتا ہے، جس میں سارے اوصاف شامل ہیں۔ جب صحیح انسانیت میں ''شام'' چھائی ہوئی تھی اور

صحرا کو تھی حکومت بستاں کی آرزو
دیو سیہ کو تخت سلیماں کی آرزو
بدرو کو حسن یوسف کنعاں کی آرزو
ابلیس کو جلالت یزداں کی آزرو
پھر تاج گر رہا تھا سر مشرقین کا
منہ تک رہی تھی گردش دوراں حسین کا

جوش کے مرثیہ کی خاص بات یہ ہے کہ وہ تاسئ حسین پر ابھارتا ہے، جوش نے بین اور بکا کا اہتمام جان بوجھ کرنہیں کیا یہ نہیں کہ وہ گریہ جو جائز نہیں سمجھتے، بلکہ اس لیے کہ وہ امام حسین کو سیرت کو سامنے رکھ دورِ جدید کی یذیدی نخوت کو توڑنا چاہتے ہیں، اس لیے وہ رونے کے بجائے جوش پیدا کرنے والا انداز اختیار کرتے ہیں۔

اعزاز بندگان گرامی دو چند ہو
اے کربلا کی خاک فلک تک بلند ہو

ہاں تم بھی ناصران شہید جفا بڑھو
اے شاہ زادگانِ دیار وفا بڑھو۔۔۔!!
اے شاہدانِ گل رخ و گلگوں قبا بڑھو
زینب بلا رہی ہے تمہیں فاطمہ بڑھو
اے چرخ افتخار کے شمس و قمر بڑھو
عباس منتظر ہیں، علی اکبر بڑھو

نام یزید رینگ مقامات پست میں
اے فتح خود قریب بدل جا شکست میں

ایک اور مقام پر امام حسین کو یوں خراج پیش کیا گیا ہے۔

تو نے دلوں کو دولت بیدار بخش دی
خوف اجل سے ہمت پیکار بخش دی
نطق گدا کو طاقت بیدار بخش دی
پیش خدیو جرات انکار بخش دی
مظلوم کے غرور کو بیدار کر دیا
ناطاقتی کی نبض کو تلوار کر دیا

جوش شوکت الفاظ کا شاعر ہے۔ یہ لفاظی یہ اسلوب قصیدہ کے لیے زیادہ موزوں سمجھا جاتا ہے ،لیکن چونکہ جوش کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ پرانی طرز کا مرثیہ نہیں لکھ رہے بلکہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے

اس میں نیا رنگ بھر رہے ہیں۔ ڈاکٹر ہلال نقوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''جوش کو لفظیات پر، جو بے پناہ قابو اور تشبیہات و استعارات کے برتنے پر جو مضبوط گرفت حاصل ہے اس میں قصیدے کا شکوہ ایک ادبی طاقت کے طور پر بہت نمایاں ہے۔ ان کے لہجے میں جو دبدبہ، طنطنہ جلال اور طمطراق ہے اس کا شجرہ ادب صنف قصیدہ سے جا کر ملتا ہے۔ قدرت بیان میں یہ صدی شاید ان کی نظیر نہ پیش کر سکے۔''(۲۹)

ہاں اے حسین مصلح افکار مرحبا
اے بے نیاز اندک و بسیار مرحبا
اے تیغ انقلاب کی جھنکار مرحبا
اے دست کردگار کی تلوار مرحبا
تو نے لہو سے شمع جلا دی عقول کی
ہوتا نہ تو تو نبض نہ چلتی اصول کی

ہاں جوش اب پکار کہ اے میر کربلا
اس بیسویں صدی کی طرف بھی نظر اٹھا
ہاں دیکھ یہ خروش یہ ہلچل یہ زلزلہ
اب سینکڑوں یزید ہیں کل اک یزید تھا
طاقت ہی حق ہے، شور ہے یہ گاؤں گاؤں میں
زنجیر پڑ رہی ہے پھر انساں کے پاؤں میں

اس مرثیے کا اختتام کچھ اس انداز سے ہو رہا ہے۔

اے ناخدائے کشتیِ افکار المدد
فرماں روائے کشور اسرار المدد
اے باب شہر علم کے دلدار المدد
اے جانشین احمد مختار المدد
داتا، گدائے راہ کا ارماں نکال دے
کونین کو فقیر کی جھولی میں ڈال دے

عظمت انساں

نامی مرثیہ ۶۳۔۱۹۶۲ء میں تصنیف ہوا یہ ۸۸ بندوں پر مشتمل چھے ابواب میں منقسم کیا گیا۔ جب کہ ہم جانتے ہیں انسان، عظمت انساں اور وحدت انسانی جوش کے افکار کی بنیاد ہے۔ رثائی شاعری کے علاوہ بھی ان موضوعات پر لکھتے رہے۔ اس مرثیے کو پڑھ کر لگتا ہے کہ یہ اسی تسلسل فکر کا نتیجہ ہے۔ پرانے کلاسیکل مرثیے سے انحراف کے بعد وہ جن جدتوں کو نئے مرثیے میں متعارف کروا رہے تھے، وہ ''عظمت انساں'' سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مرثیے کے پرانے اجزا بالکل مختلف تھے جبکہ جوش نے ان کے بجائے اپنے کچھ مرثیوں کو ابواب میں تقسیم کرنے کا تجربہ کیا ہے۔ اس مرثیہ کے مندرجہ ذیل چھے ابواب ہیں۔ (۱) قلم (۲) انسان (۳) اہمیت خدمت انسان (۴) حسین (۵) خادم انسانیت (۶) عزاداروں سے خطاب اور کربلا

وہ انسان کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اوج الوہیت کے حامل انسان کا نام حسین ہے۔ ان کی شاعری کا محبوب ہیرو حسینؑ ہے۔ اس باب میں مصطفیٰ زیدی کا یہ بیان بڑا اہم ہے۔

''میں تو خدا سے دعا کرتا ہوں کہ کاش جوش خدا کے سچے منکروں میں ہوتے تو ہمیں ان کے اس نوع کے کلام میں ٹوٹے جوتوں اور پھٹی عباؤں کے علاوہ بہت

کچھ مل جاتا لیکن ابتدا سے ابتک کبھی جوش ان سچے منکروں کے حلقے میں شامل نہیں ہوئے۔ سنبل و سلاسل کی تمام رباعیوں اور عرش و فرش کی تمام نظموں کے باوجود جوش صاحب کے الحاد کا ڈانواں ڈول ہونا روز روشن کی طرح عیاں رہے۔ جوش صاحب نے کارل مارکس کی زبان ایک ڈھیلا ڈھالا قصیدہ بھی لکھ رکھا ہے اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف داری بھی گاہ گاہ کی ہے۔ لیکن ان کے ہیرو نہ کارل مارکس بن سکے نہ جوزف سٹالن بلکہ ہمیشہ انہوں نے امام حسینؓ کو اپنا قبلہ نظر جانا اور مانا۔"(۳۰)

اس مرثیے کا آغاز قلم کی تعریف سے ہوتا ہے اور قلم کو وہ علم کے کنائے کے طور دیکھتے ہیں۔ عظمت انساں جن چیزوں کی وجہ سے ہے، قلم کا درجہ طشت از بام ہے، جوش کا ایک بند ملاحظہ ہو، جس میں قلم کو یوں خراج پیش کیا جارہا ہے۔

تو خذف کو قمر و لعل و گہر دیتا ہے
شب لب تشنہ کو گل بانگ سحر دیتا ہے
موج تخیل کو لفظوں میں کتر دیتا ہے
روح کاغذ کے مسامات میں دھر دیتا ہے
خامشی کو ہمہ تن ساز بنا دیتا ہے
تو خیالات کو آواز بنا دیتا ہے۔

اسی باب کے آخر میں جوش قلم کے حضور یہ التجا پیش کرتے ہیں۔

اے قلم نور فشاں ہو کہ دمک جائے زمیں
ظلمت وہم میں ضوبار ہو خورشید یقیں

حیف اس دور جواں پر کہ یہ ایں عقل مبیں
آدمی کی عظمت کا اسے اندازہ نہیں
حسن ارضی پہ سماوات کو شیدا کر دے
آدمی کیا ہے یہ دنیا پہ ہویدا کر دے

انسان والے باب میں یہ بات باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے انسان اپنی ماہیت میں کیا، اس کی اصلیت کیا ہے اور وہ کیا کچھ کرسکتا ہے۔ وہ حضرت انسان کو مذہب وملت، ذات پات، امیر وغریب گورے کالے، عجمی وعربی اور شرقی وغربی کے خانوں میں تقسیم کر کے نہیں دیکھتے۔ روئے زمین پر حیاتیاتی انسان ان کے نزدیک صرف اور صرف انسان ہے۔ اسی کے بارے میں ہی وہ کہتا ہے۔

عشوۂ زہرہ جبیناں ہے اسی کے دم سے
خاک رقصاں وغزل خواں ہے اسی کے دم سے
دور میں جام بہاراں ہے اسی کے دم سے
مستی گردش دوراں ہے اسی کے دم سے
خیمہ جشن شبستاں میں سویرا ہو جائے
یہ اٹھ جائے تو دنیا میں اندھیرا ہو جائے

اس کی محراب میں غلطیدہ فرشتوں کا ورود
اس کی سرکار میں جبرئیل امیں سر بہ سجود
اس کے انکار کی پاداش میں شیطان مردود

اس کا جنت سے ہبوط اصل میں ہیجان صعود

خلد کو تج کے تھرکتی ہوئی جنت پائی

خاک کی گود میں آیا تو خلافت پائی

آدمی کی پہچان کرانے کے بعد اس مرثیہ میں اس بات پر اگلے باب میں اہمیت خدمت انسان کو واضح کیا گیا ہے، یہ ایک منطقی بات ہے کہ جو انسان اتنی عظمت کا حامل ہے وہ خدمت کا حامل بھی ہے۔ جوش بیسویں صدی میں بھلا دیئے جانے والے انسان کو بازیاب کرانا چاہتے ہیں۔ دو عالمی جنگوں کے بعد دنیا میں جو بے گانگی کا عالم میں دیکھنے میں آیا تھا، جوش اسے اپنی فنکارانہ عینک سے دیکھ رہے تھے۔ کہ انسان، انسان سے بیگانہ ہو چکا ہے، اسے کسی طرح بشریت کی معرفت دلائی جائے تا کہ انسان، انسان سے آگاہ ہو سکے۔

تلخ کاموں کو پلاتا ہے جو آبِ شیریں

بخشتا ہے کسی مضطر کو جو کیف نمکیں

عمر بھر خدمتِ انسان سے جو تھکتا ہی نہیں

اس کی سرکار میں خود عرش جھکاتا جبیں

اپنے زانوں پہ جو دکھیوں کو سلا لیتا ہے

اس کو اللہ کلیجے سے لگا لیتا ہے

اس مرثیے کا باب چہارم ''حسین، خادم انسانیت'' ہے۔ کلاسیکی مرثیے میں وہ تمام خانوادہ رسول جو دین کی سربلندی کے لیے امام حسین کے ساتھ کربلا آیا تھا ان سب کو بطور کردار مرثیہ میں خوب ابھارا گیا ہے۔ ان مرثیوں کو پڑھ کر کرداروں کی ایک بہار ہمارے سامنے آتی ہے، باہم انسانی رشتوں کو اپنی تہذیبی قدروں کے ساتھ جوڑ کر کردار نگاری کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔ جوش کے مرثیوں میں صرف اور صرف کربلا کے ہیرو، جناب امام حسینؑ کی کردار نگاری زورِ قلم صرف ہوا ہے۔ دیگر کرداروں کا اگر کہیں ذکر ہوا ہے تو وہ

مضمون کی زیریں سطح کے طور پر ہوا ہے۔ اس سلسلے میں جوش خود اپنی کتاب یادوں کی برات میں یوں رقم طراز ہیں۔

''وہ حسین جس کے نظام انفاس کی، اطمینان آمیز ہمواری کی زد پر میدان کربلا کی بادِ سموم کا دم ٹوٹ گیا، جس کے لبوں کی خشکی دیکھ کر فرات کی موجیں آب آب ہو کر رہ گئی تھیں اور جس کے چہرے کی شادابی کو دیکھ کر کربلا کے تپتے سورج کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں، وہ حسین، جس نے اس ارادے سے کہ ایوان حق کے چراغاں پر کوئی آنچ نہ آسکے، اپنے گھر کے تمام چراغوں کو بجھا دیا تھا اور ناموس انسانی کو بچانے کی خاطر، جس نے فولاد کو پگھلا دینے والے عزم اور زلزلوں کی سانس اکھاڑ دینے والے ثبات کے ساتھ موت سے ٹکر لی تھی اور ایسی ٹکر کہ موت کی پیشانی سے لہو کا فوارہ جاری ہو گیا تھا۔ یذید توانا تھا، قانون قدرت کے مطابق ہونا یہ چاہیے تھا کہ یذید، حسین کو شکست دے کر حسینیت کا چراغ گل کر دیتا، لیکن ہوا یہ کہ قانون قدرت کے علی الرغم، حسین کی ناتوانی نے یذید کی توانائی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔۔۔ اور اپنی مقتولیت کی ایک ضرب سے قاتل کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ موت جس کے صرف تصور سے بڑے بڑے ساونتوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں وہ موت، منہ کھولے جب حسین کے سامنے آئی تو حسین اس کو دیکھ کر ایسی حقارت کے ساتھ مسکرائے کہ خود موت کی نبضیں ساقط ہو کر رہ گئیں۔

سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اس وقت بھی جب کہ تیروں کا موسلا دھار مینہ برس رہا تھا، اور حسین اپنے رفیقوں اور جگر گوشوں کی لاشیں، میدان سے اٹھا اٹھا کر بار بار خیمے کی طرف جا رہے تھے اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ جب کہ ان کے تمام انصار و اقربا موت کی نیند سو چکے تھے اور ان کا قتل ایک یقینی امر بن چکا تھا، عین اس نازک ترین اور مہلک لمحہ میں بھی ان کے حواس بجا تھے،

اور ایک سپاہی کا حوصلہ مندانہ تبسم ان کے لبوں پر کھیل رہا تھا۔۔۔اور یہ دیکھ کر کہ ہیبت باطل سے حق کا چہرہ سفید ہو چلا ہے، وہ اس پر سرخی دوڑانے کے لیے، بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا خون روانہ کر رہے تھے۔صرف یہی نہیں کہ اس یقینی حالت کے موقع پر ان حواس کے بجا تھے، بلکہ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی قربانی دے چکنے کے بعد بھی، انکے چہرے پر اس فخر و مباہات کی ایک ایسی معمولی سی دھاری بھی رونما نہیں ہوئی تھی، اور ان کی زبان سے ایک ایسا آدھا لفظ بھی ادا نہیں ہوا تھا جس سے پتا چلتا کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اہل اسلام میں نے غیرت اسلام کے آفتاب کو ڈوبنے سے بچا کر، تم پر احسان کیا ہے، اور میں نے اپنے واسطے یہ حق خرید لیا ہے کہ تم مجھ کو ایثار کا دیوتا سمجھ کر، میرے سامنے اپنی گردنیں جھکا لو۔

اے حسین۔۔۔اے دریا کے زہر سے آب حیات پینے والے اے بپھرے طوفان کو اپنے سینے میں ڈبونے والے۔اے حریم شہادت کے سب سے اونچے مینارے، اے ہمت مردانہ کے اوتار اور اے ثبات عزم کے پروردگار۔ازل سے لے کر ابد تک کے انسانیت کا، غلامانہ سلام قبول کر۔''(۳۱)

بقول جوشؔ

اتنی حدت میں بھی آہنگ زمستاں تھے حسینؑ
آب و رنگ چمن وابر بہاراں تھے حسینؑ
کشت آئین رسالت کے نگہباں تھے حسینؑ
فرق سے تا بہ قدم، موسم باراں تھے حسینؑ
جھوم کر چرغ پہ قبلے سے گھٹا آتی تھی
بات کرتے تھے تو جنت کی ہوا اتی تھی

مصر مقتل میں جواب مہ کعاں تھے حسین
طرفہ اک زمزمہ نوحہ بداماں تھے حسین
صبح افسردگی شام غریباں تھے حسین
کوثر تشنہ وہاں، خندہ گریاں تھے حسین
دشت فریاد میں گل بانگ ترنم تھے حسین
لیلی آہ کے ہونٹوں کا تبسم تھے حسین

تاج نے آل محمدؐ پہ جو روکا پانی
پیاس کے ابر سے یوں ٹوٹ کے برسا پانی
بے دھڑک قصر حکومت میں در آیا پانی
ہوگیا سر سے شہنشاہ کے اونچا پانی
تاج داری مع اورنگ و نگیں ڈوب گئی
آسماں سے جولڑی تھی وہ زمیں ڈوب گئی

قطرہ دل میں لیے ایک سمندر تھے حسین
ذات واحد میں سمیٹے ہوئے لشکر تھے حسین

دین آداب رفاقت کے پیمبر تھے حسین
جان دینے پہ جو آئے، تو بہتر تھے حسین
سرفرشتوں کے یہاں آج بھی خم ہوتے ہیں
ایسے انسان رسولوں میں بھی کم ہوتے ہیں

اس مرثیے کے باب پنجم میں ''عزاداروں سے خطاب'' میں بھی یہی گلا ہے کہ جس قوم کا ہیرو حسین جیسا ہے اس کی سرنگیں شرر بار کیوں نہیں، اس کے ارمانوں کو انگاروں کی طرف دیکھنا چاہیے، اس قوم کی آنکھیں تو غم کے آنسوؤں سے آباد ہیں لیکن جذبہ حسینی سے اس قوم کے سینے بنجر ہیں بلکہ وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں۔

ے جو حسینی بھی ہے اور موت سے بھی ڈرتا ہے
ہاں وہ توہین حسین ابن علی کرتا ہے

اپنے مکمل تنقیدی شعور کے ساتھ وہ قوم کو بے دار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ گلا کرنے کے بعد حسین کے اصل عزادار کی مختلف نشانیاں گنواتے گنواتے انہیں باطل سے نہ دینے والے ایسے گورما قرار دیتے ہیں۔

ے مثل شبیر جو پیغام عمل دیتے ہیں
ایسے ہی لوگ زمانے کو بدل دیتے ہیں

زبانی کلامی حسینی ہونے کا دعویٰ کرنے والے عزاداروں سے وہ بڑے ہی تند و تیز، غصیلے، زہریلے اور سنگین لہجے میں یوں خطاب کرتے ہیں۔

قوم وہ قوم ہے جو عزم کی متوالی ہے
دین بے روح فقط دین کی نقالی ہے

دل ہے غافل تو عبادت بھی بد اعمالی ہے
بے عمل قوم کی قرات نہیں قوالی ہے
موت کے وقت کی ''یسٰین'' بنا رکھا ہے
دین کو آپ نے اک بین بنا رکھا ہے

''عظمت انساں'' کے آخری باب ''کربلا'' میں یوں لگتا ہے کہ جوش ''کل یوم عاشورہ'' وکل ارض کربلا کا استغاثہ حسینی بلند کرتا ہے اور ھل من ناصر الینصر نا کی صدائے احتجاج لگا تا ہے۔ جوش کو اس حقیقت کا اچھی طرح علم ہے۔ کہ چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی ازل سے ستیز کار رہا ہے لہٰذا اس سے نپٹنے کے لیے ہمیشہ تازہ کربلا کی ضرورت رہے گی، چنانچہ جوش کی مرثیہ نگاری میں خصوصیت کے ساتھ کربلا علامتی انداز میں در آتی ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہیں۔

کربلا اب بھی سر وقت پہ لہراتی ہے
زلف کی طرح خیالات پہ بل کھاتی ہے
خامشی رات کو حس وقت کر جھا جاتی ہے
دل زینب کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کبھی ظلمت میں جو کوندا سا لپک جاتا ہے
ایک قرآن بلندی پہ نظر آتا ہے

کربلا سر سے کفن باندھ کے جب آتی ہے
وسعت ارض و ساوات پہ چھا جاتی ہے

تند انفاس سے فولاد کو گرماتی ہے
تبر و تیر کو خطرے میں نہیں لاتی ہے
چڑھ کے نیزے پہ دو عالم کو ہلا دیتی ہے
کربلا موت کو دیوانہ بنا دیتی ہے

یعنی جوش نے کربلا کا ایسا تصور پیش کیا ہے جو موت کا دیوانہ بنا دے۔ وہ کربلا کو میراروں کا آہنی قلعہ اور چلتی ہوئی تلواروں کا میدان سمجھتے ہیں۔ ایسا میدان جس میں زندہ رہنے کے لیے ہر وقت برسرپیکار رہنا پڑتا ہے جسے ہر وقت استبدادی واستحصالی قوتوں سے جنگ کرنا ہوتی ہے کیونکہ جوش کے نزدیک کربلا

؎ فکر حق سوز یہاں کاشت نہیں کرسکتی
کربلا تاج کو برداشت نہیں کرسکتی

اگرچہ تاج برطانیہ کا سامراجی طوق تقسیم کے نتیجے میں اتر چکا تھا، اس دور میں تاج کا ایک مخصوص مفہوم اور مطلب تھا، تقسیم کے بعد مقامی نمائندہ سمجھتے ہیں۔ ان کا سیاسی شعور اس لحاظ سے پختہ ہے ریاستوں کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں، حکومت کا قیام کیسے وجود میں آنا چاہیے اور حکومت چلائی کیسے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے، جوش نے اس مرثیہ کے آخری باب کے آخر میں اہل اقتدار و سیاست کو یہ پیغام دیا ہے۔

؎ کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

''موت آل محمدؐ کی نظر میں''

جوش کا ایک معروف مرثیہ ہے، پاکستان آمد کے بعد ۱۹۶۵ء میں اسے تصنیف کیا گیا۔ ۸۶ بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ ابواب بندی کے بغیر ہے، حالانکہ جوش نے اس دور کے کچھ مرثیوں میں اجزائی ترکیب و ترتیب کے لحاظ سے جدت طرازی سے کام لیا تھا۔

اس کائنات میں انسانی زندگی کے اندر ''موت'' سے زیادہ کوئی بھی خوف ناک شے نہیں۔ انسان کے تصورات سے لے کر احساسات تک موت کا انمٹ نقش ثبت ہو جاتا ہے یہ موت کا خوف ہی ہے جو کئی وسوسوں، وہموں اور توہمات کا باعث بن کر انسان کو مقام انسان سے اتار دیتا ہے۔ موت ہمارے شعور کا مزاج بن کر ہماری نفسیات کو اسیر کر لیتی ہے۔ یہ اسیری نسل در نسل اپنے اثرات منتقل کرتی ہو تہذیب در تہذیب نفوذ کر جاتی ہے۔

موت کے بھیانک تصور پر قابو پانا فلسفوں اور سائنسوں کے بس میں نہیں تھا، اس ڈراونے خواب کا شافی علاج، جوش ملیح آبادی کو محمد و آل محمد کے در سے ملا۔ جوش بنیادی طور پر مذہب بیزار آدمی ہے محمد و آل محمد جیسی معتبر مذہبی شخصیات کا احترام، ان کے ہاں فکری ہم آہنگی کی وجہ سے ہے۔ موت، کو بھی اس در سے جب مات ملتی نظر آتی ہے تو جوش اس خانوادے کی محبت کا دم بھرنے لگتا ہے۔

مذکورہ مرثیے میں جوش نے موت کا منحوس چہرہ کئی بندوں میں دکھانے کی کوشش کی ہے، ان کے نزدیک موت، اداسی، بے نوائی، بے حسی، سناٹا، اندھیرا بے شعوری اور خاموشی کا نام ہے۔ ایک دو بند کچھ اس طرح ہیں۔

موت کیڑوں کی غذائے خستہ، قبروں کا فشار
استخوان سوز و نفس گیر و توانائی شکار
جاں فگار و نطق درد و روح کوب و جسم خوار
اس کی شامیں نالہ جانکاہ ، صبحیں سوگوار
اس کے دام سخت میں آکر اکڑ جاتے ہیں لوگ
دفن جلدی سے نہ ہو جائیں تو سڑ جاتے ہیں لوگ

پتھروں پر کس قدر شیشے گرا دیتی ہے موت
کنج شب میں کتنی صبحوں کو سلا دیتی ہے موت
کتنی گودوں ، کتنی کوکھوں کو جلا دیتی ہے موت
کتنے سہروں، کتنی سیجوں کو دعا دیتی ہے موت
کتنی چاہوں، کس قدر راہوں تو مرجھاتی ہے موت
کتنی دکھتی کروٹوں پر رقص فرماتی ہے موت

اسی بھیانک موت کی حقیقت جب محمدؐ عربی جسے دبیر نکتہ کہہ کر جوش نے مخاطب کیا ہے، اس کے حضور یوں خراج پیش کرتا ہے۔

اے محمدؐ، اے سوار توسنِ وقت رواں
اے محمدؐ، اے طبیب فطرت و نباض جان
اے محمدؐ، اے فقیہ نفس و نقاد جہاں
موت کو تو نے وہ بخشی آب و تاب جاوداں
زندگانی کے پجاری موت پر مرنے لگے
لوگ پیغام اجل کی آرزو کرنے لگے

سب سے پہلے دہر کو تو نے ہی سمجھائی یہ بات
طاق ایوان شہادت میں ہے قندیل حیات
سرفروشی ہے متاع زندگانی کی زکوت

موج کوثر کی سنی کا پیک ہے نخل فرات

عرش اتر آتا ہے فرش گرم گیر و دار پر

رقص کرتی ہے دوامی زندگی تلوار پر

ویسے تو جوش کو دہریت پسند کہا جاتا ہے، اور یہ کوئی دروغ گوئی بھی نہیں لیکن ان اشعار اور اس قبیل کے اشعار میں وہ نہ صرف عزمِ حسین کو بیداری کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں بلکہ وہ آنحضورؐ کی حقانیت پر بھی ایمان لے آئے ہیں۔

خاک کے ذرات کو تو نے ثریا کر دیا

آگ کو پانی کیا، پانی کو صہبا کر دیا

موت سی کالی بلا کو اشک سلمیٰ کر دیا

آخری ہچکی کو گل بانگ مسیحا کر دیا

سر سے خوف نیستی کی یوں بلائیں ٹال دیں

آدمی نے موت کی گردن میں باہیں ڈال دیں

معروف دانشور سبط حسن نے جوش کے بارے میں لکھا تھا۔

''ان کی فکر (جوش کی فکر) میں خلافت یزید سے انکار اور کربلا کا حادثہ کوئی وقتی نہیں بلکہ راہ حق میں جہاد کی ایک ابدی للکار ہے۔'' (۳۲)

اس مرثیے میں بھی رسالت مآب کے بعد وہ حسین جری کو سلام عقیدت پیش کرتا ہے کہ اس نے موت کے معانی بدل کے رکھ دیئے۔ یزیدی اشقیاء کو خاک میں ملا دیا، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یزیدی نخوت کو شکست دی۔ اس کا واحد ہتھیار، ظلم، جبر اور تشدد تھا، ریاسی مشینری کو یزید اپنے حریف کو موت کا مزا چکھانے کے لیے استعمال کیا، مگر امام حسینؑ نے موت کو اپنا ہمنوا بنا لیا اور وہ مر کر بھی امر ہو گئے۔ اور یزید زندہ

رہنے کے باوجود مردود ہو کر رہ گیا۔

اخذ کرتا ہے جو غم سے شادمانی وہ حسین
جس کی اب تک ہے دلوں پر حکمرانی وہ حسین
موت تھی جس کی نگاہوں میں سہانی وہ حسین
تشنگی سے پی تھی جس نے زندگانی وہ حسین
سرخ انگاروں کو جس نے خاک کر کے رکھ دیا
جس نے دامانِ حکومت چاک کر کے رکھ دیا

''یہ ایک حقیقت ہے کہ جوش نے اپنے مرثیوں میں کلاسک مرثیوں کے تعین کردہ اجزاء کا اہتمام نہیں، مرثیے میں چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین کو کسی خاص تسلسل اور ترکیب سے یا بالکل ہی نہیں لکھا۔'' (۳۳)

اس مرثیے میں بھی ہمیں مذکورہ اجزاء کی ترتیب و لحاظ نظر نہیں آتا، حسینؑ کو اپنے ہیرو کے طور پر ہر جگہ عزم و ہمت کے حوالے کے طور پر ضرور لے آتے ہیں، بکا اور گریے کے لیے ان کا تذکرہ کرنا جوش کے نظریہ مرثیہ گوئی کے خلاف ہے، تاسئ حسین پر ابھارنے کے لیے جا بجا اشاروں کی بہار دکھائی دیتی ہے۔ اس مرثیے میں جوش اپنے اسی نظریے کی تائید میں یوں کہتے ہیں۔

سوگواری کا مزا جب ہے رفیقان کبار۔۔۔!!
رخ پہ تابِ عزم ہو، آنکھوں میں تابِ ذوالفقار
ہم عناں ہوں طبل و جنگ و نالہ بے اختیار
دل میں حرمانِ خزاں ہو، سر میں سوائے بہار

بات جب ہے، غم ابھار جذبہ پیکار پر
ایک دل پر ہاتھ ہو اک ہاتھ ہو تلوار پر

یہ متاع چشم نم یہ دولت قلب دو نیم
ہیچ ہے انساں، اگر ڈھونڈے نہ راہ مستقیم
مان ہی سکتی نہیں اس بات کو عقل سلیم
صرف ماتم ہو مآل مقصد ذبح عظیم
خون باطل ہے تب و تاب حسام کربلا
آنسوؤں سے ہے بہت اونچا مقام کربلا

یہ نہیں کہ جوش کو گریہ پسند نہیں، یا وہ اسے کوئی غیر فطری چیز سمجھتے ہوں، انہیں اس بات کا اچھی طرح ادراک ہے کہ گریہ، ماتم، غم انسانی فطری کا خاصہ ہیں، یہ دنیا غموں کی آماجگاہ ہے اور اس میں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پا ہی نہیں سکتا، اور امام حسین سے دلی عقیدت و محبت رکھنے والا کوئی بھی درمند انسان غم حسین سے دور نہیں رہ سکتا، اسی نقطہ کو یوں اجاگر کیا گیا ہے۔

گریہ فطری امر ہے جی بھر کے رو اور بار بار
ماتم شبیر میں روتا ہوں میں بھی زار زار۔۔۔!!
میں تو کیا اس غم سے جنبش میں ہے قلب روزگار
غور فرما لیکن اس نکتے پہ بھی اے سوگوار
غم نہیں طرہ طرف کلاہ کربلا

سورما کی موت ہے میراث شاہ کربلا

نسل آدم سے یہ اب تک کہہ رہی ہے کربلا
اے ستم کش تیرا فطری حق ہے فریاد وبکا
لیکن اس گرداب شیون میں نہ اتنا ڈوب جا
فوت ہو جائے شہید کربلا کا مدعا
حق کا باطل پر تفوق ، آدمی کا فرض ہے
خون صبر کربلا نوع بشر پر قرض ہے

اپنے مرثیوں میں جوش نے اپنے تصور مرثیہ نگاری کو تقریباً ہر جگہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ اسی بنا پر ان کے مرثیوں میں پیکار حسینی کی للکار تو سنائی دیتی ہے لیکن شہادت پر بین اور آہ وزاری کی پکار سے یہ مرثیے سراسر خالی ہیں۔ کلاسیکی مرثیے سے یہ گریز شعوری سطح پر ہے۔ جوش کو اس بات کا اندازہ ہے کہ انیس و دبیر نے صنف مرثیہ نگاری کو جس عروج تک پہنچا دیا ہے، اس میں کسی لحاظ سے بھی اضافے کی گنجائش ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا خواہ مخواہ اسی ڈگر پر چلنا انکے لکیر کا فقیر بننے والی بات ہے۔ مگر کچھ محققین جوش اس گریز اور خود ساختہ جدت طرازی کو، جوش کی فنکارانہ صلاحیتوں کی کمی پر محمول کرتے ہیں۔ چنانچہ شفقت رضوی کا ایک بیان ملاحظہ ہو۔

”کہا جاتا ہے کہ موجودہ صدی میں مرثیہ نگاری کا نیا رنگ سامنے آیا اور اس کو فروغ دینے میں جوش نے اہم کردار ادا کیا ہے وقت کے ساتھ فکر کا بدلنا اور نئے نئے تجربات کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تجربے نے فن کے حسن میں اضافہ کیا ہے یا نہیں۔ جدید مرثیے کے تجربات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موضوعاتی ہیں۔ یہ ایک انتہائی مضحکہ خیز دعویٰ ہے، اس سے ثابت کرنا ہوگا کہ قدیم

مرثیے غیر موضوعاتی یا بغیر کسی موضوع کے لکھے جاتے ہیں، اگر ان کوئی موضوع ہوتا ہی نہ تھا تو ان کے اس قدر چرچے کیوں رہے۔ تمام مرثیہ نگاروں کی بشمول انیس و دبیر، مرثیہ نگاری پر خامہ فرسائی کیوں کی گئی جب ان کا کوئی موضوع نہیں تو انہیں مرثیہ یا شاعری کہا ہی کیوں جاتا ہے؟ قدیم مرثیوں میں بھی موضوعات تھے ان کا ابتدائی حصہ (چہرہ) اسی غرض سے لکھا جاتا تھااس میں دین، خدا، قرآن، رسول اور انکے احکام کا ذکر ہوتا، جس شخصیت کا مرثیہ ہوتا اس کا کردار بیان کیا جاتا، اس کا سراپا ہوتا، سیرت کے اجزاء ہوتے، بہادری کے کارناموں کا ذکر ہوتا، دین، خدا اور رسول سے والہانہ محبت کے تذکرے ہوتے، اخلاقیات کے درس ہوتے غرض اس بات کو موضوع بنایا جاتا جس کا تعلق کسی بھی شہید کربلا سے ہوتا۔ اگر متذکرہ موضوعات کو قابل اظہار تسلیم ہی نہ کیا جائے تو اور بات ہے، حالانکہ چہرے میں جو موضوع ہوتا اس کیا ہمیت ایسی تمہید کی ہوتی کہ شخصیت کے کردار کو ابھارنے میں مدد ملتی۔ مرثیے کے ظاہر حصہ باہم پیوست ہوتا اس کے لیے کسی مصنوعی پیوندکاری کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔‘‘(۳۴)

مگر جوش کو ان چیزوں کی پرواہ نہیں ہے، انہیں بس دھن ہے تو اس بات کی کہ کربلا کے رونے والے تصور کو بدل کر سوگواروں میں اندوہ ودلگیری کے بجائے انقلابی روح پھونکی جائے۔ لہٰذا شہادت کے مظلومانہ واقعات اوران پر جگرسوز بین کرنا جوش کے ہاں نہیں ملتے، وہ مرثیے کا اختتام بھی اس انداز سے کرتے ہیں۔

کربلا! پرورگار! داورا!

کب سے میری قوم گہری نیند میں ہے مبتلا

کب سے پامال فقیر خواب ہے میری صدا

نیند آنکھوں کی اڑا دے، جوت سینوں کی جگا

یا، لگا دے سینہ مومن میں باغ زندگی
یا بجھا دے اے خدا میرا چراغ زندگی

''ارتقائے خاک''

یہ ان کا آٹھواں مرثیہ ہے جو ۶۸۔۱۹۶۷ء کو منظر عام پر آیا۔اس مرثیے کو جوش نے مندرجہ ذیل سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

☆افتراق نجوم ☆دور آتش ☆دور آب ☆دور نباتات وحیات

☆عظمت خاک ☆حسینؑ ☆معجزہ خاک اور سوگواران حسینؑ سے خطاب

یہ غیر مطبوعہ مرثیہ تھا جسے جوش صاحب کی آواز کے ٹیپ سے حاصل کیا گیا ہے، اس لیے کچھ مصرعوں میں کچھ لفظ مسنگ ہیں اور اس کے بندوں کی تعداد کا بھی صحیح تعین نہیں کیا جاسکتا، اس سلسلے میں ہلال نقوی صاحب یوں رقم طراز ہیں:

> ''یہ مرثیہ چونکہ کسی مسودے یا قلمی نسخے سے نہیں بلکہ جوش صاحب کی آواز کے ٹیپ سے نقل کیا گیا ہے اسی لیے سامعین کی داد وتحسین کی گونجتی آوازوں کے سبب مختلف لفظ کسی طور پر واضح نہیں ہو سکے۔۶۰۰ مصرعوں پر مشتمل اس مرثیہ کے پانچ مصرع ایسے ہیں جو باوجود پوری توجہ کے سنے نہیں جاسکے اور اکسٹھ مصرعے ایسے ہیں جن کا کوئی ایک لفظ یا ایک سے زیادہ الفاظ واضح نہیں ہوتے۔تخلیق کار کی اصل تخلیق کے سکھے ہوئے لفظوں کی من وعن صورت اور صحت متن کے اصولوں کا تقاضا یہی ہے کہ انہیں اسی صورت میں محفوظ کر دیا جائے۔اصل قلمی نسخے کی دریافت ہی اس خلا کو پر کر سکے گی۔''(۳۵)

''ارتقائے خاک'' میں جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہو رہا ہے جوش ملیح آبادی نے عالمانہ انداز سے بات کا آغاز کیا ہے۔کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی، کہکشائیں، ستارے، سیارے کس طرح وجود میں آئے خصوصاً

زمین کی ابتدا اور سیارہ زمین پر زندگی کا ظہور کس طرح ممکن ہوا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جس طرح کے ادب کی توقع کی جاسکتی تھی، جوش ملیح آبادی کے ہاں اس کی واضح کی جاسکتی تھی، جوش ملیح آبادی کے ہاں اس کی واضح جھلک موجود ہے۔ منشی پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں جو خطبہ صدارت پیش کیا تھا، اس میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔

''بہرحال جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض لوریاں گا گا کر سلانا، محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا، اس وقت تک ادیب کے لیے عمل کی ضرورت نہ تھی وہ دیوانہ تھا، جس کا غم دوسرے کھاتے تھے، مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔'' (۳۶)

اسی رسالے میں ایک اور مضمون نگار نے اپنے خیالات کو یوں پیش کیا ہے۔

''اسی طرح ترقی پسندوں نے غزل کے حوالے سے یہی بات اپنے عصر کے جدید تقاضوں کی روشنی میں کہی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر غزل کا معیار یہی ہے جو آج کل کہی جارہی ہے تو پھر اس کے امکانات مفقود ہیں۔ کیونکہ ادب صرف حیات و کائنات کی ترجمانی ہی نہیں کرتا بلکہ زندگی کو آگے بھی بڑھاتا ہے۔ جینے کی لگ پیدا کرتا ہے، سماجی شعور، تہذیبی ادراک، اور ثقافتی آگہی عطا کرتا ہے۔'' (۳۷)

محولہ بالا دو اقتباسات کو سامنے رکھا جائے تو جوش جیسا تنقیدی شعور رکھنے والا شاعر گرد و پیش کے حالات سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ انکے مرثیے اسی تفکر سے لبریز انقلابی روح اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں جب غزل نئی کروٹ لے رہی تھی تو نظم اور مرثیہ میں ان مضامین کو پیش کرنا تو اور بھی آسان تھا۔

مذکورہ مرثیہ کے پہلے باب میں افتراق نجوم کے اندر وہ کائنات کے تخلیقی فینا میتا کو زیر بحث لاتے ہوئے اس مقام پر پہنچتے ہیں۔

ہاں قلم اس مسئلے پر ایک ٹھٹرتی روشنی
ابتداء کیونکر ہوئی اس عالم اسباب کی
لیکن اس انداز سے گوکل کو جیسے بالزی
چمپئی الفاظ پر ہو یوں سروں کی چاندنی
جیسے کوئل کوک اٹھتی ہے بھری برسات میں
جس طرح آئینہ چوتھی کی دلہن کے ہات میں

یہ زمیں جس میں عناصر کی ہے اتنی ریل پیل
جس میں کھیلا جا رہا ہے زندگی کا آج کھیل
کیا خبر کس دن پڑی تھی اس کرے کی داغ بیل
کب ہوا تھا تند خو اضداد میں یہ ہیل میل
سوچتا ہوں ، عمر جب اس حلقہ ایجاد کی
سانس رک جاتی ہے گھبرائے ہوئے اعداد کی

جب افتراق نجوم ہوا، زمین سورج سے الگ ہوگئی تو یکا یک یہ کرہ ارض زندگی کے قابل نہیں ہوا، بلکہ اس کا ٹمپریچر تھمنے میں کروڑوں سال لگے۔ ہر وقت بجلی کڑکتی رہتی، تابکاری شعاعوں کا نفوذ ہوتا رہا، اس عہد کو جوش نے ''دور آتش'' کا نام دیا ہے۔

اس اکھاڑے میں زمین کا کوئی چلتا تھا نہ داؤں
مانگتی پھرتی تھی پانی، ڈھونڈتی پھرتی چھاؤں
دھوپ کے چھاتی پہ بھالے، آگ کی سر پر کھڑاؤں
طنطناہٹ ، لپ لپاہٹ، دن دناہٹ ہاؤں ہاؤں
یہ زمیں، جز انتشار و ابتلا کچھ بھی نہ تھی
کربلا کی پیش گوئی کے سوا کچھ بھی نہ تھی

یعنی زمین پر زندگی کے وجود سے پہلے جس طرح کے دھماکے ہو رہے تھے، انکو شاعر نے کربلا کا پیش خیمہ قرار دیا ہے، اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ زندگی نے زمین کے اوپر بڑی مشکل سے اپنی جگہ بنائی ہے اور اس کی بقا بھی اسی میں مضمر ہے کہ ہنگاموں، طوفانوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ، جذبہ اور ولولہ ہو۔

دوسرے معنوں میں کربلا کو زندگی کی پیکار مسلسل کو علامت بنا دیا ہے۔

دور آتش، کے بعد ''دورِ آب'' آتا ہے۔ زمین پر پانی کے وجود کے بعد ہی اس کرہ پر ایک فضا بنتی ہے، جو آب و ہوا بنانے میں معاون ثابت ہے اور اس کے بعد موسم وجود میں آتے ہیں۔ جس کے بعد اسی پانی سے زندگی کا بیڑا اٹھایا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں جدید سائنسی تحقیقات نے ہمارے سامنے رکھ دی ہیں۔ ان چیزوں کو شعری قالب میں ڈھالنا کوئی آسان نہ تھا چہ جائیکہ انہیں مرثیے کا موضوع بنا دیا جائے۔ جوش ویسے بھی مرثیہ نگار کیلیے مختلف علوم کا حامل ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔

''حیات جس قدر اجازت دے ہر علم سے کچھ نہ کچھ ہنر یاب ضرور ہو (مرثیہ گو)۔'' (۴۸)

اور بالآخر بفیض بے کران ماہ و سال
ہوگیا جب مہر تار افروز سے کچھ انفصال

دم بدم گھٹنے لگا عفریت آتش کا جلال
تب مزاج دہر میں پیدا ہوا کچھ اعتدال
تار اونگھی ،بوستاں بر دوش تاری آگئی
آنچ کجلائی تو پانی کی سواری آگئی

بدلیاں رقصاں ہوئیں، برتائیاں چھانے لگیں
دشت پر گاتی گھٹائیں بیج برسانے لگیں
رس کی بوندیں پتھروں پر پور چٹکانے لگیں
ایرنے چٹخائیں پوریں، ندیاں گانے لگیں
دلنشیں رم جھم سے پیدا زمرے ہونے لگے
خانہ ارض خنک میں رتجگے ہونے لگے

جوش کا یہاں رنگ تغزل عروج پر دکھائی دیتی ہے شعری جمالیات کی قدروں سے وہ بخوبی واقف ہیں جابجا خوبصورت تشبیہات ، نایاب استعارے دل موہ لینے والی تلازمہ کاری سے وہ شعر میں جان بھر دیتے ہیں، اس باب کا آخری بیت دیکھئے:

خاک کو سر رشتہ زلف گل ترل گیا
بحر کیا پایا عروس دہر کو بر مل گیا

پانی کو عروس دہر کا بر قرار دینا انتہائی اچھوتا خیال ہے اور موقع محل کی مناسبت سے جادو بن کر صرف ہوا ہے دوسرے مصرعے میں بحر، دہر اور بر کے استعمال سے ایک قسم کا صوتی تکرار پیدا ہوا جس سے شعر میں شعریت کے ساتھ ساتھ موسیقیت بھی پیدا ہوگئی۔

پانی کے ظہور کے بعد ''دورِ نبات و حیات'' کا آغاز ہوگیا۔ جوش، اس باب میں اس تفصیل میں نہیں پڑتے کہ پہلے نباتات وجود میں آئے یا حیوانات، ان کی ساخت کیا تھی، وہ خوردنی جاندار یک خلوی تھے یا کثیر خلوی، اس کے بجائے اجمالاً تذکرے سے کام لیا گیا۔

خاک پھر گلزار بنکر عطر افشاں ہوگئی
جنگلوں میں کوک کر جان بہاراں ہوگئی
شکل حیوانی میں آئی اور خروشاں ہوگئی
اور جب اس میں ذہن در آیا تو انسان ہوگئی
شکل انساں میں فقائے قدس تک جانے لگی
وارث آفاق بن کر ناز فرمانے لگی

''نباتات و حیات'' کے بعد براہ راست عظمت خاک کا گریز لے کر نوع انسانی کے وجود پذیر ہونے کی بات ہونے لگتی ہے۔ خاک یہاں پر انسان کا کنایہ ہے جسے مختلف شکلوں سے جوش متعارف کراتا ہے۔

خاک ہی نور ہدایت، خاک ہی طور صفا
خاک سلطان عرب، فرماں روائے کربلا
پیکر یوسف میں خوشبو، روئے اکبر پر ضیا
خاک مسجود ملائک ، خاک محبوب خدا
خاک ہے دارالعمل کی سروری کے واسطے
اور پھر پیغمبری و داوری کے واسطے

اللہ اللہ کیا وقار ہے بے پناہ خاک ہے

کہکشاں کی تابنا کی گرد راہ خاک ہے

طور محو انتظار یک نگاہ خاک ہے

عرش اعظم طرہ طرف کلاہ خاک ہے

آتش مغرور ہے بے عنوان بن کر رہ گئی

خاک سے ٹکرائی تو شیطان بن کر رہ گئی

باب ششم میں حسینؑ کو معجزہ خاک قرار دیا گیا ہے۔

فرش سے تا عرش برکات حسین ابن علی

ابتلا و کرب ، آیات حسین ابن علی

شمع حق تزئین مشکوٰت حسین ابن علی

خاک کا اعجاز ہی ذات حسین ابن علی

حشر کے دن تک رہے گی دھوم ان کے نام کی

زندگی ہیں یہ خدا کے آخری پیغام کی

شاعر، امام حسین کو بیداری کا استعارہ خیال کرتا ہے، لہٰذا اپنے مرثیوں میں جوش نے انکے اندر ایک سورما کی صورت دیکھی ہے، جسے نظریہ حیات کے سامنے زندگی معمولی نظر آتی ہے، اور کون و مکاں کی عظمتوں کو اس کے قدموں کی دھول ہے، جوش، مذہب سے ہٹ کر بھی امام حسین کو عظیم سپوت کے طور پر ماننے کو تیار ہے، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جوش طبعاً آزاد خیال مذہب بے زار شخص تھا، اس کے باوجود مذہبی شخصیات کا احترام دل و جان سے کرتا ہے۔ چنانچہ حسینؑ، کو وہ پوری انسانیت کا ناز، اور خاک کا معجزہ قرار دیتا ہے۔

تو نہ ہوتا بھی اگر فرزند دلبند رسول
پور دوش مرتضیٰ و نور آغوش بتول
باپ بھی تیرا نہ پاتا اس قدرحسن قبول
تیرے نانا پر بھی گر ہوتا نہ قرآں کا نزول
گونج امامت کی بھی ہوتی گر نہ تیرے ساز میں
پھر بھی فرق آتا نہ آقا ترے اعزاز میں

امام کے پائے استقلال میں جوش کو کسی مقام پر بھی جھول نظر نہیں آتا۔ اسی لیے وہ خاندانی سیادت کے بجائے کردار کی بلندی کو پیش نظر رکھتے ہوئے امام کو ہیرو مانتا ہے۔

خاندانوں پر نہیں ہوتا سیادت کا مدار
اس فروغ اتفاقی کا بھلا کیا اعتبار
باپ کی عزت نہیں بنتی ہے بیٹے کا وقار
آدمی کردار سے بنتا ہے میر روزگار
جس کے قدموں پر جبین ثابت و سیار ہے
وہ فقط کردار ہے، کردار ہے، کردار ہے

ویسے بھی ڈاکٹر ہلال نقوی کے سوال:

''کیا مرثیہ گو شاعر کے لیے عالم دین ہونا ضروری ہے؟

جوش: دین کا دور تو اب ختم ہو رہا ہے اور یہ گاڑی اب چلے گی نہیں۔'' (۳۹)

یہی وجہ ہے کہ جوش کو امام حسینؑ کے دینی رول کے بجائے تاریخی رول نے متاثر کیا ہے، بقول ڈاکٹر

ہلال نقوی:

"۔۔۔جوش اردو زبان کے پہلے مرثیہ گو شاعر ہیں جنہیں امام حسینؑ کے ہاں دینی رول نہیں تاریخی اقدار جلوہ گر ہوگئی ہیں اور انکے مرثیوں میں بڑی شاعری کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مذہب کا آدمی صرف اس لحاظ سے بڑا نہیں ہوتا کہ وہ فلاں مذہب کا آدمی ہے، اگر ایسا ہوتا تو سارے مذہبی مناقشے ختم ہوگئے ہوتے، آدمی اس واسطے سے بڑا ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص مذہب کا ہونے کے باوجود اپنے مذہب سے بھی زیادہ بڑا ہوتا ہے، آنحضرتؐ صرف مسلمانوں کے نہیں ساری کائنات کے رہبر و رہنما ہیں یا اسی طرح امام شیعوں یا مسلمانوں کی جاگیر نہیں ہیں، وہ پوری دنیا کے ہیں۔" (۴۰)

اس مرثیے ارتقائے خاک کا ایک بند کچھ اس طرح ہے۔

اے حسین، اے گلشن اقدار کے فرد رواں
اے فروغ خاکیاں و آب و تاب روئے جاں
اے دبیر نقش و آفاق، میر قدسیاں
تو اگر ہوتا نہ آواز خدا کا پاسباں
ڈھیر لگتے وحی کے جلتے ہوئے کلمات کے
راکھ میں تبدیل ہو جاتے حروف آیات کے

آخری بند میں جوش کو اپنے سارے تصورات کا مثالی ہیرو یوں نظر آتا ہے۔

بیعت فاسق میں تھا گنجینۂ لعل و گہر
پرنیاں و اطلس و منقش و مال و سیم و زر

مسند و ایوان و قصر و طمطراق و کروفر

تو نے اب سب کی طرف دیکھا نہ بھی مڑ کر مگر

آبروئے فقر پر شاہی کی دولت واردی

تاج سلطاں پر تری غیرت نے ٹھوکر مار دی

''ارتقائے خاک'' کا آخری باب ''سوگواران حسین سے خطاب'' ہے۔ابتدائے آفرینش سے لے کر ارتقا کے مختلف مراحل کا اس مرثیے میں جوش نے احاطہ کیا ہے'ارتقائے خاک'' اپنے بلیغ استعاراتی و علامتی مفہوم سموئے ہوئے ہے۔ ایک طرف تو اس سے مراد زمینی سیارے کا وجود میں آتا ہے اور دوسری طرف اسی خاک کا نمو پذیر ہو کر زندگی، اور اس کے مختلف مظاہر میں ڈھلنا بھی مراد ہے۔انہی مظاہر میں سے انسان کا وجود حیران کن اور انہی انسانوں میں حسین کا ظہور معجزہ خاک بن جاتا ہے۔حسین کیذات والا صفات کے اندر زندگی بقا اور کائنات میں پنپنے کی تمام باتیں موجود ہیں، حسین کی تگ وتاز اور موت کو مار دینے کی ادا اسے ممتاز و مفتخر بناتی ہے، اسی بناپر جوش نے گریہ و بکا سے قصد احتراز کرتیہوئے جدت طرازی کی ہے اور وہی حسینی جذبہ سوگواران حسین کے اندر انڈیلنے چاہتے ہیں، کلاسیکی مرثیے کا اختتام گریہ پہ ہوتا تھا، یہ اس دور کی ضرورت تھی کیونکہ جابر حکومتوں کے آمرانہ دور میں احتجاج کا یہی طریقہ اختیار کیا جاسکتا تھا، اسی حکمت عملی کے نتیجے میں ہر دور میں کربلا زندہ رہی، حسینیت کی زیریں لہریں صدیوں کا سفر کر کے ہم تک بھی پہنچ گئیں۔ جوش نے اپنے انٹرویو میں کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار بھی کیا تھا۔

> ''مرثیہ گو کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ بکا پر تان ٹوٹے، لکھتے وقت کوئی مصرعہ یا بند وقت قلب کا آجائے تو اور بات ہے لیکن اس کی نیت نہ ہو کہ رلا کر اٹھائے بلکہ جھنجھوڑ کر اٹھائے، باطل سے ٹکرانے کی حرارت، سلطان جابر کے سامنے حرف حق کہنے کی جرات اور جذبہ تاسی حسین، ان چیزوں کا پیدا کرنا مرثیہ گو شاعر کا فرض ہونا چاہیے۔''(۴۱)

اسی جوش نے اپنے لہجے کی گھن گرج کا سوگواران حسین سے یہ اظہار کیا۔

قصر شاہی میں خوشامد مجلس و ماتم میں بین
اپنے قول و فعل میں کتنا ہے بعد مشرقین
ہم ہیں گرم سعی شام و کربلا کے بین بین
دل میں بانگ یا امیر شام لب پر یا حسین
منبروں کی چھاؤں میں شاہ عرب کے ساتھ ہیں
زندگی دھوپ میں ہم بولہب کے ساتھ ہیں

انہیں مزید جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ خطیبوں کی گرج یہ سوز خوانوں کے گلے
مجلسوں کی یہ فغاں یہ شاعروں کے مرثیے
ہیں یہ سارے سوگوارانہ ادب کے چٹکلے
نعرہ صلوۃ و حرف مرحبا کے واسطے
ہم کو تقلید حسین و مرتضیٰ سے کیا غرض
ارض فن کے ولولے ہیں کربلا سے کیا غرض

جوش ملیح آبادی نے شبیر کے صبر وغم اور آہ وفغاں کو بھی ایک نئی جہت سے دیکھا ہے۔

صبر بھی اک نام تھا شبیر کی یلغار کا
آہ بھی تھی ایک پہلو قاتلوں پر وار کا

غم کا استعمال بھی حربہ تھا اک پیکار کا
کام سینے کی خراشوں سے لیا تلوار کا
وقت شیون جب ذرا پلکوں کو جنبش ہوگئی
فرق سلطانی پہ انگاروں کی بارش ہوگئی

کربلا کو فتح کرنے کے بعد یہ بچا کھچا حسینی قافلہ کوفہ و شام کی طرف پیش قدمی کے لیے بڑھا، تو عام مرثیہ گویوں سے ہٹ کر جوش نے یوں نقشہ کھینچا ہے۔

شام کی جانب چلی جب صبح آل مصطفیٰ ۔۔۔!!
سلطنت کی دوپہر کی سمت جھپٹا، جھٹ پٹا
اور فرق حضرت زینب ہوا جب بے ردا
تخت کانپا، تاج سلطانی پہ گھن بجنے لگا
لو نکل آئی زمین و قلزم ذخار سے
سید سجاد کی زنجیر کی جھنکار سے

جب بھرے دربار میں زینب ہوئیں گرم سخن
آنکھ سے تابندگی ، آواز سے پھوٹی کرن
لہجہ پیغمبری سے گونج اٹھی انجمن
روئے فاسق پر ابھر آئی خجالت کی چبھن
اور خطابت کا دھواں جب آگ برسانے لگا

تو خطیب منبر طاغوت تھرانے لگا

مرثیے کو بڑے ہی شاندار خراج کے ساتھ اس بند پر جوش نے یوں ختم کیا۔

اے حسینؑ اے صاحب گلگوں قبا و کج کلاہ
اے کمال ارتقائے خاک اعظم کے گواہ
اے امامت آستاں والے سالت بارگاہ
اے حقائق کے پیغمبر ، اے معارف کے اِلہٰ
مشعل محراب ایوان اب وجد السلام
اے حسین اے غازہ روئے محمد السلام

''پانی''

کے عنوان سے لکھا گیا جوش کا نواں اور آخری مرثیہ ہے ۵۹ بندوں پر مشتمل اس مرثیے کا سال تصنیف ۱۹۷۱ء ہے۔ آواز حق ۱۹۲۰ء سے پانی ۱۹۷۱ء تک، جوش کی مرثیہ نگاری کا سفر کوئی پچاس سالوں پر محیط ہے تمام مرثیوں میں جوش کے لہجے کی گھن گرج، خطابیہ انداز اور تفکر کی فنکارانہ آمیزش کو برقرار رکھا ہے آگ، پانی، خاک پر ہم نے ان کے مرثیے دیکھے، عناصر اربعہ کے ہر تین اجزا ہیں، جن میں سے چوتھا جز ہوا کا ہے۔ ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے جوش کی پوری شاعری بالعموم اور مرثیہ بالخصوص اس فکر سے ثروت مند ہے۔ یعنی یوں لگتا ہے جیسے عناصر اربعہ جوش کی مستقل فکری کا لازمی ترین حصہ ہیں۔ ڈاکٹر ہلال نقوی اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں۔

''ایک رزمیہ و رجزیہ آہنگ کے ساتھ جوش صاحب کی شاعری میں عناصر اربعہ (ہوا، پانی، مٹی، آگ) کا بیان عرش وفرش کے لیے گراں سلسلوں کے تخیلاتی سفر کے درمیان حیات و کائنات کی گونجتی، گرجتی تفسیر سے عبارت ہے۔ آگ اور خاک کے موضوع پر ان کے مرثیے ہمارے پیش نظر ہیں۔ پانی کا موضوع بھی ابتدائے

شاعری سے ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ برسات پر ان کی ان گنت نظمیں، اسی اظہار کا ایک رخ ہیں، جن میں ساون کے موسموں کی دھوم دھام میں ابر رواں کی نرمی بھی ہے اور طوفان کی تندی و تیزی بھی۔'' (۴۲)

ویسے تو یہ مرثیہ ڈاکٹر ہلال نقوی کے مطابق پہلی دفعہ بہاولپور میں پڑھایا گیا تھا۔ اس کے بعد کراچی کی ایک مجلس میں جوش صاحب نے مرثیہ پڑھا۔ بقول ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی:

''میر انیس کی صد سالہ برسی کے موقع پر جوش نے ۱۹۷۱ء میں ''رنگ میر انیس'' میں پانی کے عنوان سے مرثیہ کہا اور ایرانیان ہال کی مجلس میں پیش کیا۔ اس مجلس کی منظر نگاری کے لیے صفحات درکار ہوں گے۔ ہزاروں کے مجمع میں جوش نے اپنی گرجدار خوبصورت آواز میں یہ مرثیہ شروع کیا:

'ہاں اے صباح طبع شب تار سے نکل'

مطلع سے مقطع تک ایک ایک مصرع پر سامعین اپنی نشستوں سے اٹھ اٹھ کر داد دے رہے تھے، اس مجلس کے علاوہ میں نے پاکستان کے مشاہیر علماء، دانشور، ادیب اور شاعروں کو پھر کسی مجلس میں ایک جگہ جمع ہوتے نہیں دیکھا۔'' (۴۳)

محولہ بالا عبارت میں ''رنگ میر انیس'' سے یہ التباس نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ جوش صاحب نے میر انیس کی طرز کا کلاسیکی مرثیہ کہا ہوگا، جس میں مرثیے کے اجزائے ترکیبی کا لحاظ رکھا گیا ہوگا۔ نہیں، اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں، اس کا مطلب ہے کہ جوش نے بھی دیگر شعراء کی طرح میر انیس کا بالاستیعاب مطالعہ کر رکھا تھا، میر انیس جس طرح منظر نگاری، جذبات نگاری اور شعری جمالیات کی فن کاری پر مہارت رکھتے ہیں اسی انداز کو جوش نے بھی اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس بات کی وضاحت خود ضمیر اختر نقوی صاحب نے بھی کی ہے۔

''جوش صاحب نے استعارہ کی اہمیت کا احساس اور مناسبت لفظ کا حسن، یہ نکات میر انیس سے سیکھے ہیں، جوش کی قادر الکلامی اور فنکارانہ گہرائی کلام انیس کی

مرہون منت ہے۔یہی وجہ ہے کہ میر انیس اور جوش کے مرثیوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دونوں کا انداز بیان اسلوب، لہجے اور آہنگ میں کافی مماثلت ہے۔انداز بیان اور بلاغت اظہار کی مشترک خوبیوں کے علاوہ دونوں کی زبان میں اتنی مماثلت ہے کہ سو سال کے زمانی بعد کے باوجود بالکل ایک سی معلوم ہوتی ہے۔"(۴۴)

پانی زندگی کی ضمانت اور کربلا میں تشنگی کی علامت بھی ہے۔اس لیے جوش نے پانی کی مختلف صورتیں اور اس کے مظاہر زندگی پر اثرات کا جائزہ لیا ہے۔پانی کی اہمیت و کیفیت بتانے کے بعد جوش پانی کی کہانی کو کربلا تک لے آتا ہے۔گرمی کی شدت میں خاندان زہرا پانی کی بوند بوند کو ترس رہا تھا۔

جوش اپنے دل سے کہتے ہیں:

جس میں ہو رقص و رنگ و روانی کی داستاں
اے دل کی آگ چھیڑ وہ پانی کی داستاں

اگرچہ یہ مرثیہ موضوعاتی ہے لیکن اس میں کچھ دیگر مرثیوں کی طرح جوش صاحب نے ابواب بندی کا اہتمام نہیں کیا۔روایتی مرثیے کی طرح جوش نے بہت خوبصورت بہاویہ خوشگوار چہرہ کئی کی ہے۔قصائد کا رنگ لیٹے ہوئے ہے یہ چہرہ جوش کے ناقدین ان کے مرثیوں کو اس وجہ سے بھی مرثیہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان کی زبان قصائد کی زبان ہے۔شفقت رضوی اس انداز بیان کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا تھا:

"اپنے مسدس میں جوش "مرثیہ گو" سے زیادہ قصیدہ گو دکھائی دیتے ہیں۔ جاگیردارانہ معاشرے میں زندگی گزارنے والوں کی محبوب صنف سخن قصیدہ ہے۔ان میں بلند مرتبت قصیدہ سننے کے عادی ہوتے ہیں اور کم مرتبت قصیدہ گوئی کے!! قصیدے کی شان ناقابل یقین غلو ہے اور جوش اس فن کے ماہر ہیں۔جب وہ مبالغے پر آتے ہیں تو انہیں اپنے ذہن اور قلم پر قابو نہیں رہتا۔"(۴۵)

میرے خیال سے شفقت رضوی صاحب کا اعتراض اس لحاظ سے بے محل اور معاندانہ ہے کہ وہ جوش کے مرثیوں کو مرثیہ کہتے ہی نہیں بلکہ وہ انہیں مسدس کا نام دیتے ہیں، وگرنہ اگر جوش کی اپنی رائے کو مان لیا جائے کہ جس کے مطابق وہ ان مسدس نما نظموں کو مرثیہ ہی کہتے رہے ہیں تو پھر جوش کی یہ زبان اس کے تصور مرثیہ نگاری کی آئینہ دار محسوس ہوگی۔ جوش کو ہر لمحے اس بات کا احساس تھا کہ وہ روایتی مرثیہ کی بجائے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ایک جدید مرثیہ کہہ رہے ہیں۔ جس میں جدتیں، جوش نے بذات خود شروع کی تھیں۔ قصائد نگاری والے انداز بیان کا دفاع کرتے ہوئے ڈاکٹر ہلال نقوی نے کہا تھا۔

> ''جوش کو لفظیات پر جو بے پناہ قابو اور تشبیہات و استعارات کے برتنے پر جو مضبوط گرفت حاصل ہے، اس میں قصیدے کا شکوہ ایک ادبی طاقت کی طور پر بہت نمایاں ہے۔ ان کے لہجے میں جو دیدبہ طنطنہ، جلال اور طمطراق ہے اس کا شجرہ ادب صنف قصیدہ سے جا کر ملتا ہے۔ قدرت بیان میں یہ صدی شاید ان کی نظریہ پیش کر سکے۔'' (۴۶)

ابتدائی چند بند ملاحظہ ہوں

بہتی ہوئی ندی کی روانی کا جلترنگ
متوالیوں کے دل کی گرجتی ہوئی امنگ
سبزے کی لہر، پھول کی خوشبو، دھنک کا رنگ
آہنگ میں ڈھلے ہوئے مدھ ماتیوں کے انگ
اور یہ جو عود و چنگ ہیں برکھا کی رات میں
ان سب کی باگ ڈور ہے پانی کے ہات میں

موجوں میں آب گوہر و مرجاں لیے ہوئے
جیب رواں میں قطرہ نیساں لیے ہوئے
موج رواں میں عشوۂ ترکاں لیے ہوئے
کالی گھٹا میں زلف نگاراں لیے ہوئے
کولہے پر ہات طرفہ ادا سے دھرے ہوئے
پھولوں سے مرغزار کی جھولی بھرے ہوئے

اسی طرح کی ایک خوبصورت تشبیہ درج ذیل ہے۔

کرتا ہے نصب موج پہ خیمے حباب کے
پھرتا ہے وقت صبح، کٹورے گلاب کے

جوش انقلابی طبیعت غزل کے دھیمے اور نفیس جذبات کی عکاسی کے لیے زیادہ موزوں نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خود کو نظم کے لیے وقف کر دیا، اہی انقلابی، احتجاجی اور خطابیہ لہجہ مرثیوں میں بھی برقرار رکھا۔ تقی عابدی صاحب نے بھی اردو ادب کو متوجہ کرنے کی کوشش تھی۔

> ''یہ سچ ہے کہ جوش کے لہجے اور بیان میں جو سخت اور بے پاک ''مردانہ پن'' تھا وہ انکو غزل کے لطیف مبالغانہ صنف شاعری میں نہیں مل سکتا تھا، یعنی جوش سونے کی تلوار پر حدید کی تلوار جس کی برش تیز اور عمل سریع ہو، ترجیح دیتے تھے۔ اگرچہ بڑی حد تک اس جوشیلی کیفیت کو ان کی نظموں نے سنبھالا لیکن بہرحال طویل مسدس اور مرثیے ہی ان کے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کو اگلنے میں بڑی حد تک کام آئے، چنانچہ اس انقلابی اور حق کی جنگ کا اعلان انہوں نے اپنی بچپن کی نظم ''ترانہ بے گانگی'' میں کر دیا تھا

دوسرے عالم میں ہوں دنیا سے میری جنگ ہے

تاج شاہی سے قدم بھی مس کروں تو ننگ ہے

اور یہی دو چیزیں یعنی دنیوی طاقتوں سے جنگ اور تاج شاہی کو ننگ قرار دینے سے جوش کی زندگی تنگ ہوگئی لیکن جوش اپنی فطرت اور ارادہ میں سنگ خارا کی طرح ناقابل ذوب تھے۔ وہ کربلا کی درسگاہ کو شاہی ایوانات کے لیے استعمال کر رہے تھے جو ناانصافی اور غیر انسانی بنیادوں پر تعمیر کیے گئے تھے۔ جس میں اینٹوں کی جگہ مظلوم انسانوں کے اعضائے بدنی اور پانی کے بجائے محرومین کا خون استعمال کیا گیا تھا۔" (۴۷)

پانی کے موضوع کو بھی جوش نے اپنے مخصوص انداز میں برتا ہے، لہجے کی گھن گرج اور طبیعت کا طنطنہ "پانی" کے چہرے کے ہر بند سے عیاں اور واضح ہے۔

جھمکے فراز پر تو گھٹا جھومنے لگے

مچلے نشیب میں تو فضا جھومنے لگے

چہکے تو قمریوں کی صدا جھومنے لگے

ناچے تو روح ارض و سما جھومنے لگے

کروٹ صبا میں لے تو چنبیلی مہک اٹھے

پس جائے تو بتوں کی ہتھیلی مہک اٹھے

برکھا کا راگ گائے تو ساغر چھلک اٹھیں

چہکے جو دھوم سے تو خمستاں مہک اٹھیں

رس بوندیاں گرائے تو پتے کھنک اٹھیں
کوثر میں گنگنائے تو حوریں تھرک اٹھیں
پہنچے جو عرش پر تو ملک، شست و شو کریں
زلفیں نچوڑ دے تو پیمبر وضو کریں

اسی خوشگوار پانی کو جس پر زندگی کا انحصار ہے، جوش جب کربلا کو تصور میں لاتا ہے، پیاسوں کی پیاس، گرمی کی شدت اور پرہول ماحول کا نقشہ بڑے ہی انوکھے انداز میں بیان کرتا ہے۔

موجوں پہ تشنگی تھی تسلط کیے ہوئے
ہر قطرہ فرات تھا آنسو پیے ہوئے

پانی کی کمی کے باعث، کربلا میں جوش کو یوں لگتا جیسے

پیش نظر حیات کی بستی لٹی ہوئی
زیر قدم زمین کی نبضیں چھٹی ہوئی

کربلا کا صحرا اداس، گرداب اشکبار ہونے کی وجہ سے گردوں کی کمر جھکی ہوئی اور اور فرط الم سے گیتی کی سانسیں رکی رکی محسوس ہو رہی تھیں۔ فضا شور و شین سے معمور کہیں کا راستہ کہیں کہیں سیدانیوں کے مظلومی حسین پر بین۔ کربلا کی گرم زمین پر ہر طرف لاشے بکھرے پڑے تھے، اس عالم میں اشرار، شعلے لے کر خیام کی طرف بڑھنے لگے ہر طرف ہائے ہائے کی صدائیں بلند ہو گئیں۔

اس مرثیہ کا موضوع چونکہ پانی ہے، جوش نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں بروئے کار لا کر اس کے بندوں میں پانی سے متعلقہ استعارے، اشارے، اور علامتیں لانے کی کامیاب کوشش کی ہے، پانی، موضوع اور کربلا میں آل رسولؐ کی پیاس کا بیان نہ ہو ممکن نہیں تھا، اس کے باوجود بڑے قرینے سے اپنے مخصوص تصور مرثیہ کی طرف جوش نے خود کو موڑ لیا، اس گریز پر بھی موضوع سے برگشتہ نہیں ہوئے بلکہ پانی کے تمام ممکنہ تلازمات کو برتنے میں

فنکاری کا حق ادا کیا ہے۔

شیرازہ کتاب حکومت بکھر گیا
سلطان کے غرور کا دریا اتر گیا
کردار تشنہ کام بڑا کام کر گیا
پانی سپاہ شام کے سر سے گزر گیا

سبط نبی کے عزم نے کڑکائی یوں کمان
لو دے اٹھا یقین ، دھواں بن گیا گمان
اللہ ری حرب و ضرب امام زماں کی شان
منہ سے نکل پڑی عمر سعد کی زبان
ندی غرور جاہ کی پایاب ہوگئی
فوج یذید ماہی بے آب ہوگئی

شاہی کا رنگ کاہکشانی نہیں رہا
دریائے شر میں شور روانی نہیں رہا
چتر و علم میں فر کیانی نہیں رہا
شمشیر تاجدار میں پانی نہیں رہا
ہیبت سے ناریوں کا لہو سرد ہوگیا

بیعت طلب یذید کا منہ زرد ہوگیا

جوش، اس لحاظ سے ہر وقت ہوش رہے ہیں کہ وہ جدید مرثیہ کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا ضمنی باتیں کرنے کے بعد تاسیٔ حسین، بیداری، جدید تقاضوں اور انسانی زندگی کے مسائل کی طرف دھوار قلم کا رخ موڑ لیتے ہیں۔ حسینی کردار کو ابھارنا وہ نہیں بھولتے کیونکہ وہ ہر دور کے یذید اور ہر دور کی کربلا سے ہر دور کے حسین ہی نجات دلا سکتے، بقول جوش

ع لازم ہے کہ ہر شخص حسین ابن علی ہو

پانی کی مناسبت سے حسین کے بہادرانہ جذبے کی بنا پر اسے ابر گربار کے لقب سے پکار رہا ہے۔ حسین کو مصحف حیات کی تفسیر مصطفیٰ کے خوابوں کی تعبیر، اور دست ذوالجلال کی شمشیر کہنا اسی تصور کا نتیجہ فکر ہے۔

ے اے زندگی کے سوز نہانی سلام لے
کوثر بدوش تشنہ دہانی سلام لے

کوثر بدوش تشنہ دہانی کی خوبصورت ترکیب بھی پانی کی وجہ سے وضع ہوئی ہے۔ اور آبروئے چشمہ و حیواں کشتیٔ عرفاں، سوز تشنہ دہانی، کوثر نگاہ، تحفہ شبنم جیسی تراکیب کا تعلق بھی اسی قبیل سے ہے۔

دیگر مرثیوں کی طرح ''پانی'' میں بھی مرثیے کے اجزائے ترکیبی کا خیال نہیں رکھا اور روایتی مرثیہ نگاری کے برعکس، بین و بکا کے بجائے امام حسین کو زبردست خراج تحسین کے لیے کئی بندوں میں سلام پیش کیا گیا ہے۔ آخری بند میں کچھ اس طرح ہے۔

اے وجہ افتخار اب وجد، سلام لے
اے کار ساز ابیض و اسود، سلام لے
اے ذی حیات عنبر و معبد، سلام لے
اے عارف ضمیر محمد، سلام لے

ناموس انبیاء کے نگہبان، السلام

اے رحل کائنات کے قرآن، السلام

جوش کی یہ کاوش، نظمیں ہیں یا مسدس یا کہ بقول جوش مراثی، اس مسئلہ پر جوش کے ناقدین منقسم ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس رثائی خدمت کی ادبی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، انکی پیش کش میں جوش نے شعریت وادبیت کا کمال حد تک خیال رکھا ہے۔انہیں پڑھ کر موضوع کی جدت کا احساس تو ہوتا ہی ہے، ندرت ادا بھی مزا دیتی ہے، جسے پڑھ کر نہ صرف لذت وسرشاری حاصل ہوتی ہے بلکہ طبیعت کے اندر ولولہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ڈاکٹر ضمیر اختر نے انکی ادبی شان کے علاوہ دیگر خوبیوں سے متعلق لکھا تھا۔

> ''جوش نے اردو مرثیہ کو نئی فکر اور نئی روح سے آشنا کیا ہے، انہوں نے اپنے مرثیوں میں بلند آہنگی پیدا کرنے کے لیے خطابت کا انداز اپنایا ہے۔ نرم روی اور افسردگی کے ذریعے تازگی اور شگفتگی پیدا کرنا ان کے مزاج سے مطالقت نہیں رکھتا، اس لیے جوش نے خطابت کی گھن گرج کو مرثیوں میں کامیابی سے منتقل کیا ہے۔ انہوں نے مرثیوں میں شعریت اور معنویت کو بلند آہنگی اور خطابت سے برقرار رکھا ہے۔ چونکہ خطابت کا ایک ہنر یہ بھی ہے کہ بات بار بار نرالے انداز سے دہرائی جائے تا کہ سننے والے کے ذہن میں نقش ہو جائے، اسی لیے جوش کے مرثیوں میں تخیل کی کارفرمائی پیہم رواں اور برابر آگے بڑھنے کے بجائے دائروں میں ہوتی ہے۔ وہ بار بار نئی تشبیہیں ڈھونڈتے اور اس بات کو نئے نئے پیرائے اختیار کرکے کئی مرتبہ کہتے ہیں۔ یہی کیفیت ان کی تشبیہوں اور تمثیلوں میں موجود ہے۔ جوش کو شوکت الفاظ کا شہنشاہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ میر انیس کے بعد اردو شاعری کے پورے سرمائے میں شاید کسی شاعری نے اتنی تشبیہیں استعارے اور Images استعمال کیے ہوں۔ پھر ان تشبیہوں میں ندرت اور تازگی اور تازگی ہے اور ان میں اکثر مشاہدے کے نہایت لطیف استعمال سے پیدا ہوئی ہیں۔ جوش

الفاظ پر حکمرانی کرتے ہیں، ان کے الفاظ گونجتے ،گرجتے ہوئے اور وجد کرتے ہوئے آتے ہیں۔"(۴۸)

حوالہ جات

۱۔ عبدالحق، مولوی، تبصرہ بر آوازِ حق، مشمولہ: سہ ماہی، اردو، دکن، اپریل ۱۹۲۲

۲۔ ضمیر اختر، نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، مرکز علوم اسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۲، ص ۱۱۱

۳۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء، ص ۳۱۰

۴۔ ایضاً، ص ۳۱۲

۵۔ ایضاً، ص

۶۔ ایضاً، ص

۷۔ ایضاً، ص

۸۔ ایضاً، ص

۹۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جدید مرثیے کے تین معمار، پاکستان رائٹرز گلڈ، کراچی، س ن، ص ۱۶

۱۰۔ صفدر حسین، سید، ڈاکٹر، مرثیہ بعد انیس، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۷۶

۱۱۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء، ص ۲۹۲

۱۲۔ ملیح آبادی، جوش، یادوں کی برات، جوش اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۲۶۱

۱۳۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۴۶۳

۱۴۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء، س ۵۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۷۵

۱۶۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر جدید مرثیہ کے تین معمار، پاکستان رائٹرز گلڈ، کراچی، س ندارد، ص ۳۳

۱۷۔ ایضاً،ص

۱۸۔ ایضاً،ص

۱۹۔ ایضاً،ص

۲۰۔ ایضاً،ص

۲۱۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جدید مرثیہ کے تین معمار، پاکستان رائٹرز گلڈ، کراچی سن ندارد،ص ۲۳

۲۲۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء،ص ۴۶۵

۲۳۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء،ص ۹۲

۲۴۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جدید مرثیہ کے تین معمار، پاکستان رائٹرز گلڈ، کراچی سن ندارد،ص ۲۷

۲۵۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء،ص ۴۶۶

۲۶۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء،ص

۲۷۔ ایضاً،ص

۲۸۔ ایضاً،ص

۲۹۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء،ص ۴۸۷

۳۰۔ ایضاً،ص ۴۴۱

۳۱۔ ملیح آبادی، جوش، یادوں کی برات، جوش اکیڈیمی، کراچی، ۱۹۷۰ء،ص ۲۳۹۔۲۳۸

۳۲۔ خفقت رضوی، جوش ملیح آبادی، تحقیق اور تنقید کی زد میں، فضلی سنز کراچی، ۲۰۰۱ء،ص ۹۵

۳۳۔ تقی عابدی، ڈاکٹر، جوش کی مرثیہ نگاری، مشمولہ: ارتقا، جوش نمبر، ۱۹۹۹ء،ص ۹۳

۳۴۔ شفقت رضوی، جوش ملیح آبادی تحقیق اور تنقید کی زد میں، فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۹۷۔۹۶

۳۵۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۰

۳۶۔ پریم چند، ادب کی غرض و غایت، مشمولہ: ارتقا، ۲۰۰۶ء، ص ۶۱

۳۷۔ شفیق احمد شفیق، اردو تنقید اور ترقی پسند تحریک، مشمولہ: ارتقا، ۶۱، ۲۰۰۶ء، ص ۳۰۹

۳۸۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جدید مرثیہ کے تین معمار، پاکستان رائٹرز گلڈ، کراچی، سن ندارد، ص ۲۷

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۶

۴۰۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۴۸۴۔۴۸۳

۴۱۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جدید مرثیہ کے تین معمار، پاکستان رائٹرز گلڈ، کراچی، سن ندارد، ص ۲۱

۴۲۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء، ص ۱۷۰

۴۳۔ ضمیر اختر، نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، مرکز علوم اسلامی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۲۸

۴۴۔ ایضاً، س ۹۶

۴۵۔ شفقت رضوی، جوش ملیح آبادی، تحقیق و تنقید کی زد میں، فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۹۴

۴۶۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۴۸۷

۴۷۔ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، جوش کی مرثیہ نگاری، مشمولہ: ارتقا، جوش صدی نمبر ۱۹۹۹، ص ۹۴

۴۸۔ ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر، اردو مرثیہ پاکستان میں، مرکز علوم اسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۲۲۔۱۲۱

باب چہارم:
جوش کی رثائی شاعری (سلام، رباعیات اور نظمیں

مرثیہ نگاری کے علاوہ بھی جوش نے مذہبی نوعیت کی شاعری کی ہے، ڈاکٹر ہلال نقوی نے عرفانیات جوش کے عنوان سے یہ کلام مرتب کر کے چھپوا دیا تھا، جوش کے انقلابی مرثیے نامی کتاب میں بھی ڈاکٹر موصوف نے حصہ دوم کے طور پر عرفانی و رثائی کلام کے عنوان سے اس طرح کی شاعری شامل کر دی ہے۔ سلام، رباعیات کی تعداد زیادہ تعداد نہیں ہے۔ البتہ شہرت وطوالت کے اعتبار سے چند اہم نظمیں اس حصہ میں شامل ہیں۔

ذاکر سے خطاب، سوگوارانِ حسینؑ سے خطاب اور طلوع فکر جیسی معرکتہ الآراء نظمیں ایسی ہیں کہ جن سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا، ایک اور اہم نظم سورۃ رحمٰن بھی اسی حصے میں زیر بحث آئے گی۔

ذاکر سے خطاب، جوش کی مشہور ترین نظم ہے یہ مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی، اس کے ۲۵ بند ہیں درحقیقت اس نظم میں شاعر بوجوہ ذاکر سے خوش نظر نہیں آتا، یہ نہیں کہ شاعر کو مجلس کے ادارے یا ذکر سے کوئی نفرت یا عناد ہے بلکہ اسے ذاکر سے بنیادی نوعیت کی شکایت ہے جس پر شاعر معترض بھی ہوتا ہے اور چلی کٹی بھی سناتا ہے۔ جوش کے خیال کے مطابق ذاکر حسین، منبر کے تقاضوں سے ناآشنا شخص ہے، جسے یہ پتا ہی نہیں کہ امام حسین کی قربانی کا مقصد کیا ہے اور ہم بحیثیت مسلمان قوم اس قربانی سے جدید دور میں کیا رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں، جس طرح جوش ملیح آبادی اپنے مرثیوں کے ذریعے قوم کو بیداری کا درس دے رہے تھے وہ چاہتے ہیں کہ ذاکر حسین بھی اپنے سننے والوں کو یہی درس دے تاکہ قوم اپنی اجتماعی زندگی میں بہتری لا سکے۔

وہ اسے کہتا ہے کہ اے افسردہ فطرت ذاکر، کوئی بھی حسینی موت سے نہیں ڈر سکتا، اسے ضعف کا احساس دلانا بزدلی سکھانے کے مترادف ہے، تو ابھی روح شہید کربلا سے واقف ہی نہیں، جس پر اے پیشہ ور ماتم پسند مجھے سخت استعجاب ہے، ایسا ماتم ننگ و عار کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے، وہ کہتا ہے کہ مولیٰ پہ رونا، مومن سے بعید نہیں لیکن رونے کو نصب العین بنانا کسی طرح بھی جائز نہیں

ے کون کہتا ہے کہ دل کے حق میں غم اچھا نہیں
پھر بھی شغل گریہ نصب العین بن سکتا نہیں

لیکن جوش کو اچھی طرح علم ہے کہ ذاکرین واعظین نے اس طرح کے رونے کو نصب العین کیوں بنا رکھا ہے، وہ بڑے ہی سخت لہجے میں کہتا ہے۔

سوچ تو اے ذاکر افسردہ طبع و نرم خو
آہ تو نیلام کرتا ہے شہیدوں کا لہو
تاجرانہ مشق ہے مجلس میں تیری ہاؤ ہو
فیس کا دریوزہ ہے منبر پہ تیری گفتگو
عالم اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہے تو
خون اہل بیت میں لقمے کو تر کرتا ہے تو

حرص نے تجھ کو سکھایا دناعت کا سبق
کربلا کے ذکر میں لیتا کیوں نام حق

کیا بتاؤں کیا تصور تو نے پیدا کر دیا
غیرت حق کو بھلا کر حق کو رسوا کر دیا
کربلا و خون مولا کو تماشا کر دیا
آب رکھنا یاد دبستان مصلے کر دیا
مشق گریہ، عیش کی تمہید ہے تیرے لیے
عشرہ ماہ محرم عید ہے تیرے لیے

اتنا تند و تیز لہجہ اپنانے کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے کہ جوش صاحب مجلس امام حسین کے ادارے کو ایک ایسا ادارہ بنانا چاہتے ہیں، جس سے تہذیب نفس ممکن ہو، تاکہ مومنین میں اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا جذبہ بیدار ہو جائے۔ اس لیے وہ ایسے ذاکرین کو تاجرانِ حسین سے تعبیر کرتے ہیں جنہوں نے اہل عزا کو شور وشین پہ لگا دیا۔ وہ ایسے ذاکرین کو شرم سے سر جھکا لینے کا درس دیتے ہیں اور ایسے مرد منفعل کو سمجھاتے ہوئے جوش مخاطب ہوتے ہیں در پردہ، کربلا بشاش ہے اور بظاہر ہر مضمحل جس کی رفعتوں کے آگے آسمانی بلندیاں بھی خجل ہیں وہ ذاکر سے کہتے ہیں کہ ذرا آنکھیں کھول اور دیکھ

ہات ہے ماتم میں تیرا سینہ افکار پر
اور حسین ابن علی کا ہات تھا تلوار پر

اسے مزید جھنجھوڑتے ہوئے جوش یہ لہجہ اپناتے ہیں۔

آہ تو اور ساز برگ عافیت کا اہتمام
کیوں نہیں کہتا کہ باطل کی حکومت ہے حرام
تجھ کو اور زندوں کا ڈر، کیوں اے غلام ننگ و نام
جانتا ہے رہ چکے ہیں قید میں کتنے امام
تو مثال اہلبیت پاک مر سکتا نہیں
عشق کا دعویٰ ہے اور تقلید کر سکتا نہیں

اس نظم کے تیور مرثیہ نگاری سے متعلق ان کے نظریات کا پتا دیتے ہیں۔ اس نظم کے منظر عام پر آنے کے بعد اس کے رد میں کئی ایک نظمیں لکھی گئیں، جوش کو بڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ وقت کے ساتھ ساتھ دوسری نظمیں تو قوم کے حافظے سے محو ہو گئیں لیکن یہ نظم ابھی تک اپنی شہرت برقرار رکھے ہوئے ہے، ڈاکٹر ہلال نقوی نے کہا تھا۔

''وہ ذاکر سے خطاب کس کے خلاف تھی، یہ بات وقت گزرنے کے ساتھ اتنی اہم نہیں رہی، یہ نظم اب شخصی نہیں بلکہ علامتی نظم بن گئی ہے۔ جسے بھی اس نظم میں اپنا چہرہ نظر آئے گا وہ یقیناً برہم ہوگا۔ برٹش ایمپائر کے دور تسلط میں جوش صاحب یہ چاہتے تھے کہ ہر شخص غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے سراپا احتجاج بن جائے، اس میں وہ اہل منبر کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے۔''(۱)

''سوگواران حسین سے خطاب''

۱۵ بندوں پر مشتمل اسی قبیل کی ایک نظم ہے جس میں وہ ماتم داران حسین کو فلسفہ شہادت حسین یاد کروا رہے ہیں تاکہ سوگواران اپنے حقیقی ہدف سے آشنا ہو جائیں پہلے ہی بند کی ایک بیت کچھ اس طرح ہے

موت کے سیلاب میں ہر خشک و تر بہہ جائے گا
ہاں، مگر نام حسین ابن علی رہ جائے گا

حسین کون؟ جس نے ہستی کا دھوکہ نہ کھایا ہو، سر جھکانے کا سوال ہی حسین کے باب میں فضول ہے، سوگواران حسین کے سامنے مدینے سے امام حسین کے روانہ ہونے کا منظر سامنے رکھا جاتا ہے کہ کس عالم میں وہ باغ مدینہ کو بڑے مقصد کی خاطر چھوڑ رہے ہیں اس سے وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ امام جیسے لوگ اپنے وعدے پر کس طرح ڈٹ جاتے ہیں یہ صرف بہادروں کا شیوہ ہے کہ وہ بات پر ڈٹے رہے تاکہ اندھیری رات سے صبح صادق کو نمودار کر سکیں۔

جب، تشنہ لبوں کا خون بہنے لگا اور خاک پر اسلام کا لہو بہنے لگا، تو امام آگے بڑھے

کشتی ایماں کو خون دل میں کھینا چاہیے
حق پہ جب آنچ آئے تو یوں جان دینا چاہیے

مزید آگے اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے جوش، سوگواران حسین کا خون گرمانے کے لیے کہتے

ہیں

یہ شہادت اک سبق ہے حق پرستی کے لیے

اک ستون روشنی ہے بحر ہستی کے لیے

سوگواران حسین سے اس نظم میں بھی شاعر، ذاکروں کا، واعظوں کا شکوہ کرنا بھولا نہیں۔ تقریباً ذاکر سے خطاب والے لہجے ہی میں اس نظم کے بند میں وہ مومنین سے یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

تم سے کچھ کہنا ہے اب اے سوگواران حسین

یاد بھی ہے تم کو تعلیم امام مشرقین

تا کجا بھولے رہو گے غزوہ بدر و حنین

کب تک آخر ذاکروں کے تاجرانہ شور و شین

ذاکروں نے موت کے سانچے میں دل ڈھالے نہیں

یہ شہید کربلا کے چاہنے والے نہیں

اس لیے وہ ذاکروں سے انہیں ہوشیار رہنے کی تلقین کرتا ہے، اس سلسلے میں جوش کا سبق یہ ہے کہ میر کارواں بن کر رہو، زمین کی پستوں میں آسمان بن جاؤ اور تمہارا وجود باطل کے لیے تیغ بے اماں ہو جانا چاہیے، دوستوں کے درمیان تمہاری حیثیت نور ہدایت جیسی ہونی چاہیے اور دشمنوں کے لیے یہی نور آگ کا کام کرے تو پھر مزا ہے،

اس نظم کا آخری بند ہے

دورِ محکومی میں راحت کفر عشرت ہے حرام

مہ وشوں کی چاہ، ساقی کی محبت ہے حرام

علم ناجائز ہے، دستار فضیلت ہے حرام
انتہا یہ ہے غلاموں کی عبادت ہے حرام

ان دونوں نظموں کا مزاج ایک جیسا ہی ہے، اول الذکر میں ذاکر سے شکوہ کیا گیا ہے اور آخر الذکر میں سوگوران حسین کو اپنی ذمہ داریاں سمجھنے کی طرف متوجہ کیا گیا۔ یوں لگتا ہے کہ جوش صاحب انقلاب کے لیے ان دونوں طبقات سے کافی توقع رکھتے تھے، اس لیے بار بار ان کی تربیت کرنا از بس ضروری خیال کیا گیا۔

ایک اور نظم ''آنسو اور تلوار'' میں بھی وہ شوق شہادت اور جذب عمل کے لیے نام لیوانِ حسین کو اکساتے ہیں

شوق آزادی، خیال سرفروشی ، ذوق مرگ
یہ تھے انصار حسین ابن علی کے ساز و برگ

اس نظم کے آخر میں جوش مومنوں کو حق کی قسم دیتے ہوئے میدان عمل میں حاضر ہونے کی بات کرتا ہے اس نظم کا آخری شعر ہے

مرد وہ کب ہے بھنور سے جو اُبھر سکتا نہیں
حق ہی جینے کا نہیں جو مر سکتا نہیں

''طلوع فکر'' جوش ملیح آبادی کا ایک گرانقدر مسدس ہے ۱۱۰ بندوں پر مشتمل اس طویل نظم کا موضوع حضرت علیؑ کی ذات گرامی ہے۔ قیام پاکستان کے ٹھیک ۱۰ سال بعد ۱۳ رجب المرجب کی تقریبات کو ''چہار دو صد سالہ یادگار مرتضویؑ'' کے نام سے منسوب کیا گیا، یہ تقریبات ۷ فروری سے ۱۵ فروری تک منعقد کروائی گئیں، افتتاحی تقریب کی صدارت اس وقت کے صدر پاکستان، سکندر مرزا نے کی، ۱۰ فروری کو جوش نے یہ مسدس پڑھا، جس کا احوال ارتضٰی عباس کے حوالے سے ڈاکٹر ہلال نقوی نے ''جوش کے انقلابی مرثیے'' میں یوں درج کیا ہے

''آج بھی جو حضرات اس یادگار منظر کے چشم دید گواہ ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس روز جوش کو جیسی داد ملی شاید کبھی نہ ملی ہو، جوش صاحب کو اتنی داد ملی کہ جو مہمان علماء تشریف فرما تھے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے حالانکہ وہ نظم سمجھ نہیں پا رہے تھے لیکن داد و تحسین کا شور اس قدر تھا کہ بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو جھلک پڑے۔''(۲)

ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے اس طویل نظم کو مرثیوں میں شمار کیا ہے اور اپنی مرتبہ کتاب ''جوش کے مرثیے'' میں اسے بطور مرثیہ شامل کیا ہے، جبکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے، ڈاکٹر ہلال نقوی نے ان کی اس غلطی کی نشان دہی ان الفاظ میں کی ہے۔

''جوش ملیح آبادی کے مرثیے کے مرتب (ضمیر اختر نقوی) نے طلوع فکر کو بھی مرثیے کا نام دیا ہے، یہ مرثیہ نہیں ہے، چہار وصد سالہ یادگار مرتضوی کے موقعے پر کراچی کے ایک منتخب عوامی اجتماع میں ۱۹۵۷ء میں جوش صاحب نے یہ مسدس پڑھا تھا۔ ضمیر اختر اسے مرثیہ قرار دینے کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ۔۔۔ اس مسدس کے آخر میں کربلا اور شہیدائے کربلا کا ذکر ہے، اس لیے اسے مرثیوں میں شامل کیا گیا۔''(۳)

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ طلوع فکر جوش ملیح آبادی کا مسدس ہے، جس میں وہ اپنے ممدوح حضرت علیؑ کو موضوع بیان بنایا گیا ہے اس نظم کے مضامین اور فنی مہارت سے کسی کو انکار نہیں ہے، اس نظم کے بارے میں اس دور کے اخبار ''امروز'' نے یہ خبر دی تھی۔

''اس کو بھی یادگار مرتضوی کا کارنامہ کہیے کہ جوش ملیح آبادی جو کراچی میں آکر خاموش ہو گئے تھے ان کی پہلی طویل نظم منظر عام پر آئی۔ الفاظ کی نشست، ترکیبوں کا درو بست محاوروں کا استعمال اور روزمرہ کا صرف ہی قابل توجہ نہیں بلکہ نادر

تشبیہات بھی ہیں اور بے مثل استعارے اور کنائے بھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا فراز کوہ سے شور مچاتا بہتا چلا آ رہا ہے۔ علی ممدوح ہوں اور جوش مداح تو مدح ایسی ہی ہونا چاہیے جیسی انہوں نے کہی ہے۔۔۔''(۴)

اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:

پیدا ہوا سرود ازل سلسبیل میں
اتری شعاع، سینہ فکر جمیل میں
روشن ہوئے چراغ دیار خلیل میں
جنبش ہوئی دوبارہ پر جبرئیل میں
چھٹنے لگی شعار، تفکر کے باب سے
پھوٹی کرن جبینِ رسالتمآب سے

شب ہائے این و آں میں ہوئی صبح منجلی
باد مراد، ناز سے، مچلی گلی گلی
عرفان کائنات کی چٹکی کلی کلی
اور روح ارتقاء نے پکارا کر اے علی
لے یہ کلید علم، یہ گیتی کا باب ہے
اس خاک کو ابھار کہ تو بو تراب ہے

ہاں شمع ذات، خیمہ الفاظ میں جلا
لیلائے حق کو محمل تقریر میں بٹھا
گوش بشر کو چشم حقیقت نگر بنا
کانوں سے لوگ دیکھ سکیں جلوہ خدا
تیرے بیاں پہ غلغہ اٹھے درود کا
یوں پیش کر ثبوت خدا کے وجود کا

ایک بند کی بیت کچھ اس طرح ہے۔

موج ہوا، ترانہ تہلیل ہوگئی
کونین، زیر شہپر جبرئیل ہوئی
احکام ذوالجلال کی تعمیل ہوگئی
منشائے کردار کی تکمیل ہوگئی
انساں کی عظمتوں کے دفینے ابھر گئے
وہ دیکھ زندگی کے سفینے ابھر گئے

آخری بند

لے، وہ نجف کی سمت سے آنے لگی صدا
اے جوش نکتہ سنج مری انجمن میں آ
آ، اور جھوم جھوم کے نغمات نو سنا

ساقی مرا سلام ادب لے کر میں چلا

مولائے کائنات ، اور آواز دے مجھے

اے جبرئیل! قوت پرواز دے مجھے

''جوش کے سلام''

غزل کی ہیئت میں لکھی گئی کربلائی شاعری کو سلام کہا جاتا ہے، عموماً سلاموں میں فضائل کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں لیکن بعض اوقات مصائب کے مضامین بھی سلاموں میں در آتے ہیں۔ انیس و دبیر کی طرح جوش نے کثرت سے سلام نہیں کہے، ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی مرتب کردہ تحقیقی کتاب میں ۹ سلام یکجا کیے ہیں۔

ان سلاموں میں بھی وہی طنطنہ وہی دبدبہ اور وہی جوشیلا لہجہ ہے، جس کے لیے جوش اپنی شہرت رکھتے ہیں، ان میں سے پہلے سلام کے چند اشعار دیکھیں:

؎ یہ جھجک اچھی نہیں اے سوگواران حسین

باندھ کر سر سے کفن میداں میں آنا چاہیے

یوں ابھرنے سے رہا نقش حیات جاوداں

زندگی پر خون کی مہریں لگانا چاہیے

اس سلام کا مقطع بھی اپنی مخصوص اٹھان کا حامل ہے۔

؎ پوچھ تو ، کیا کہہ رہا ہے جوش اکبر کا شباب

مینہ میں تیروں کے جوانی کو نہانا چاہیے

دوسرا سلام بھی اسی بحر میں لکھا گیا ہے جس کی ردیف یہی ہے البتہ قافیے میں الف کے بجائے ی کا

التزام کیا ہے، لگتا ہے جوش کے ذہن میں جو خیالات تھے وہ ابھی جاری تھے کہ قافیہ کی تنگ دامانی حائل ہوگئی، لہٰذا فوراً ہی نئے قافیے کا اہتمام کرتے ہوئے خیالات کی رو کو جاری رکھا۔

ے طبع میں کیا، تیغ براں میں روانی چاہیے
گل فشانی، تاکجا، اب خوں فشانی چاہیے

سن کے جس کا نام نبضیں چھوٹ جائیں موت کی
دین کے ساونت کو وہ زندگانی چاہیے

جوش ، ذکر جرات مولا پہ شیون کے عوض
رخ پہ شان فخر و ناز کامرانی چاہیے

جوش صاحب کا تیسرا سلام بھی اسی بحر میں ہے، جس میں پہلے دو سلام زیر بحث آ چکے ہیں، دیکھا جائے تو یہ بحر جوش کی پسندیدہ بحروں میں شمار ہوتی ہے، ہم نے مرثیہ نگاری اور پھر ذاکر سے خطاب جیسی نظموں کو بھی دیکھا، جوش نے یہی بحر استعمال کی ہے، فاعلاتن، فاعلائن فاعلاتن فاعلن، والی بھرپور موسیقیت کے لیے بھی مناسب ہے اور خطابیہ لہجے کے لیے بھی موزوں ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں منبر سے پیش کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں، لہٰذا جوش ملیح آبادی نے شعوری طور پر اس کا اہتمام مناسب سمجھا ہوگا۔

ے کیا نماز شاہ تھی ارکان ایمانی کے ساتھ
دل میں جھک جاتا تھا ہر سجدے میں پیشانی کے ساتھ

آنکھ میں آنسو ہوں، سینوں میں شرار زندگی
موجہ آتش بھی ہو بہتے ہوئے پانی کے ساتھ

صرف رو لینے سے قوموں کے نہیں پھرتے ہیں دن

خوں فشانی بھی ہے لازم اشک افشانی کے ساتھ

اس، مذکورہ سلام کا مقطع، جوش کا مشہور ترین مقطع ہے، جس میں ہم پورے جوش کی شخصیت کو دیکھ سکتے ہیں۔

جوش ہم ادنیٰ غلامان علی مرتضیٰ

تمکنت سے پیش آتے ہیں جہاں بانی کے ساتھ

چوتھے سلام کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو۔

حسین ابن علی! دنیا کو حیراں کر دیا تو نے

سراب تشنگی کو آبِ حیواں کر دیا تو نے

نظر اٹھتی ہے سوئے جوش تو حیرت یہ ہوتی ہے

کہ اس کافر کو اسے مولا مسلماں کردیا تو نے

پانچواں سلام، جوش کے پہلے چار سلاموں سے ذرا مختلف ہے، اس کے کچھ اشعار کو پڑھ کر غزل کا گمان ہوتا ہے۔

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو

ہم کو ہے طبل و پرچم و لشکر کی آرزو

بام جدال و گرد رہ عزم کا ہے شوق

اورنگ کی ہوس ہے، نہ افسر کی آرزو

کانٹوں پہ حق پرست بدلتے ہیں کروٹیں
بالش کا اشتیاق ، نہ بستر کی آرزو

یاد مراد و آب طرب کا نہیں ہے وقت
طوفاں کا اشتیاق ہے، صرصر کی آرزو

الغرض یہ سلام رنگ تغزل میں ڈوبا ہوا سلام ہے، اس کا نشاطیہ لہجہ معانی واسلوب کے نئے در کھول رہا ہے، موت سے جوش کیا آرزو کر رہے ہیں، ذرا ملاحظہ ہو۔

ہاں عمر جاوداں کی ہمیں بھی نوید دے
اے موت ، اے جوانی اکبر کی آرزو

چھٹے سلام کا مطلع حسینؑ کو یوں خراج پیش کر رہا ہے۔

تیری نگاہ عفو، جو دل میں اتر گئی
تیرے کرم نے حرؓ کا مقدر بنا دیا

تیرے ثبات و عزم نے خود دوش موت کو
اک دائمی حیات کا منبر بنا دیا

ایک اور اسلام میں، تلازمہ کاری، کا یہ انداز دیکھنے کے قابل ہے۔

ڈال دیتی، گہر صبح کا منہ ظلمت شام
دمک اٹھتا نہ اگر چہرہ تابان حسینؑ

دشت ظلمت میں ہوا شہر تجلی آباد

کیا تصرف ہے، زہے خانہ ویران حسینؑ

اکبراٹھ، اور اذاں دے، کہ مہک جائے نسیم

صبح ہونے پہ ہے اے یوسف کنعان حسین

آٹھواں سلام بھی جوش کی پسندیدہ بحر میں لکھا گیا ہے اس کا پہلا شعر ہے۔

یہ تعجب کیوں ہے اہل منبر و محراب میں

نطق پہ مہرے اگر جاری ہے تحسین حسین

یعنی یہ واحد سلام ہے جو کہ بغیر مطلع کے ہے۔

اس سلام کے اشعار بھی جوش کی مجموعی شخصیت کے آئینہ دار ہیں، اور یہ اشعار ان کے تصور مرثیہ نگاری کی بھی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

وقت ٹکرایا تو خود اس کی جبیں شق ہوگئی

دیکھ اے دنیا ثبات کاخ آئیں حسین

خاک پہ ہے یہ ثبوت ادعائے فتح حق

خون کی موجیں نہیں، یہ ہیں براہین حسین

آئے ہیں دربار قربانی میں سقراط و مسیح

ہاں بٹھا دو تخت کے نزدیک پائیں حسین

آب خنجر سے اگر تبلیغ کی بجھتی نہ پیاس

آبِ کوثر سے کبھی ہوتی نہ تسکیں حسین

اس کا مقطع اس لحاظ سے بڑا جاندار ہے کہ جوش جیسا مذہب بے زار آدمی دین حسین پر ناز کرتا نظر آتا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا ثبوت دلبری
جوش سا کافر منش ہے پیروِ دینِ حسین

آخری یعنی نویں سلام کا مطلع کچھ اس طرح ہے۔

للہ الحمد! کہ دل شعلہ فشاں ہے اب تک
جسم ہے پیر، مگر فکر جواں ہے اب تک

مطلع کے بعد ایک اور شعر میں صنعت تضاد کا استعمال بڑی خوبصورتی کا سبب بنا ہے۔

شام عاشور کی پر ہول صدا پر بھاری
صبح عاشور کی گلبانگ اذاں ہے اب تک

فقر اک آن میں کوثر کے کنارے پہنچا
خسروی، خشک لب و تشنہ وہاں ہے ابتک

دو گھڑی سید سجاد نے پہنا تھا جسے
پائے دولت میں وہ زنجیر گراں ہے اب تک

جوش کے سلام تعداد میں بہت کم ہیں، دستیاب سلاموں میں البتہ جوش کا لہجہ وہی ہے، جس کی وجہ سے وہ مرثیہ نگاری میں شہرت رکھتے ہیں۔ وہ شعوری طور پر ایسے مضامین باندھتے ہیں جن سے رونے رلانے سے قصداً گریز کیا گیا ہو، کیوں کہ ان کے پیش نظر امام کی قربانی سے وہ جذبہ حاصل کرنا ہے، جس سے محکومی کی

زنجیریں توڑی جاسکیں، جو پائے تخت میں لرزہ پیدا کر سکے، لہٰذا ان سلاموں میں رنگا رنگ مضامین کے بجائے ایک جیسے مضامیں آتے جاتے ہیں، البتہ ان مضامین میں شاعری کی جمالیاتی قدروں کو از حد ضروری سمجھا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان سلاموں کے اندر تشبیہ و استعارہ، اور علم بیان کی دیگر صورتوں میں تلازمہ کاری کا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔

''رباعیات جوش''

اس حصے میں جوش صاحب کی ان رباعیات پہ بات ممکن ہے جنہیں ڈاکٹر ہلال نقوی نے ''جوش کے انقلابی مرثیے'] کے دوسرے حصے میں بطور عرفانی و رثائی کلام یکجا کیا ہے، رباعی ایک مشکل صنف شاعری ہے، جس کے مخصوص اوزان کی پابندی اور پھر چاروں مصرعوں میں اسے برقرار رکھنا آسان نہیں، نسیم عباس احمر نے اپنے مضمون ''رباعیات جوش'' میں ظ، انصاری کی جوش سے متعلق رائے اس طرح بیان کی ہے۔

> ''گیارہ سو برس کے اردو فارسی شاعری کے خزانے میں اتنی پرشکوہ، ایسی بے باک، اس درجہ ولولہ خیز، اس قدر دلآویز اور فکر انگیز رباعیاں اتنی بڑی مقدار میں آج تک کسی نے نہیں دی ہیں، جتنی جوش نے۔''

ڈاکٹر احمر نے اپنے اسی مضمون میں جوش کا رباعی سے متعلق ذاتی بیان بھی لکھا ہے۔

> ''رباعی ایک بہت بڑی بلا اور نہایت جان لیوا صنف کلام ہے، یہ کم بخت چالیس برس سے پیشتر کسی بڑے سے بڑے شاعر کے بس میں آنیوالی چیز نہیں۔''(۵)

اس سلسلے میں ڈاکٹر ہلال نقوی کی رائے بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے، وہ کہتے ہیں۔

> ''میر انیس سے فراق تک رباعی کے جتنے شعراء ہیں وہ موضوع کی محدودیت کا شکار ہیں، جبکہ جوش نے رباعی میں آفاقیت کو سمیٹ لیا ہے، حسن و عشق کی جلوہ گری، رومان پسندی، معتقداتی و غیر معتقداتی تصورات فلسفیانہ اور عقلی مشاہدات، نفسیاتی امور، خرد افروزی سائنسی اسرار، طبقاتی زندگی کی الجھنیں، شراب و شباب

خدا اور خاصان خدا، غرض کون سا موضوع ہے جس کی تہیں جوش نے نہ کھولی ہوں، نادر تشبیہات، الفاظ کی نیرنگیاں، فکر کی دارائی، خلاقانہ پرواز، بیانیہ شیرینی سادگی و حلاوت، علامتی تہہ داری اور پھر یہ کہ ان کی شاعری کے ایک عمومی رجحان یعنی خطابت کی جولانی کے بجائے مکالمے کی روانی ان رباعیوں میں برسنے والی گھٹاؤں کی طرح اُمڈتی چلی جاتی ہے، اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کے جوہر جس طرح جوش نے رباعی میں دکھائے ہیں، اس کی مثالیں دینا بہت مشکل ہے۔''(۶)

انیس دبیر اور حالی کے بعد جوش نے بڑے تواتر کے ساتھ صنف رباعی کو جاری رکھا، اور اردو میں گراں قدر اضافہ کیا، ڈاکٹر محمد رضا کاظمی کے بقول:

''موضوع کی بزرگی، بیان کی برش اور دلیل کی دارائی سے یہ رباعیاں اردو شاعری کا قابل رشک عطیہ ہیں لیکن یہ محض جوش کی ابتداء ہے۔ جوش جب اپنے موضوعات کو دلیل یا روایتی اصطلاح میں ثبوت سے بے نیاز ہو کر تخیل یعنی Contemplation کی حدود میں لے آتے ہیں تو تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے۔''(۷)

ان آراء کو پڑھنے کے بعد اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جوش صاحب رباعی گوئی میں کیا مقام رکھتے ہیں، جہاں تک رثائی خدمات کے حوالے سے ان کی رباعیات کا تعلق ہے تو، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہے، صرف تیئس رباعیات پڑھنے کو ملتی ہیں جوش، جس قدر تخلیقی وفور کی حامل شخصیت تھے، انہوں نے رثائی و کربلائی نوعیت کی رباعیات کہنے میں بخل سے کام لیا ہے، حالانکہ وہ برے زود گو شاعر تھے، رباعی جیسی مشکل صنف ان کے آگے آسان تھی، بہرحال ان رباعیات کا فکری و فنی لحاظ سے مقام و مرتبہ کسی قدر کم نہیں۔ پہلی رباعی ملاحظہ ہو۔

یہ تارِ جہنم، یہ سزا کچھ بھی نہیں
یہ دغدغہ روزِ جزا، کچھ بھی نہیں
اللہ کو قہار بتانے والو
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

فکری اعتبار سے اس رباعی کے متن سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن رباعی کے تمام فنی محاسن بڑی چابکدستی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ آخری مصرع ایسا بولتا ہوا مصرع ہے، جسے آفاقیت سے ہم آغوش کر دیا ہے، اسی مضمون کے تسلسل میں ایک اور رباعی کے آخری دو مصرعے، بڑے ہی چمکدار ہیں۔

ے بندوں کو جو اک بار لگاتا ہوں گلے
اللہ کے سو بار سلام آتے ہیں

زاہد و شاعر، اردو شاعری کے دو روایتی کردار ہیں ان کرداروں کے پس پردہ گہرا علامتی مفہوم ہے، جسے جوش نے بڑے طنزیہ پیرائے میں ایک رباعی میں یوں پیش کیا ہے۔

اس سمت ہے انبار خس و کار و گیاہ
اس سمت ہے انفاس میں پھولوں کا سپاہ
زاہد ہے فقط سفیر ایماں کا امیں
شاعر ہے ضمیر مصطفیٰ سے آگاہ

''حسین اور انقلاب'' جوش کا وہ مرثیہ ہے جسے جدید اردو مرثیہ نگاری کا سنگ میل سمجھا گیا ہے۔ اس مرثیہ کے ساتھ، پانچ رباعیات بھی درج تھیں، ان میں سے اس رباعی کو اردو شاعری میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

کیا صرف مسلمانوں کے پیارے ہیں حسین
چرخ نوع بشر کے تارے ہیں حسین
انسان کو بے دار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

انہی میں سے ایک رباعی کے یہ دو مصرعے، جوش کے مجموعی تصور مرثیہ نگاری کے عکاس ہیں۔

یہ آج جو اک گونج ہے آزادی کی
یہ بھی ہے حسین ابن علی آواز

یہ باب اظہر من الشمس ہے کہ جوش ملیح آبادی مذہب بے زار رجحان کے حامل تھے، لیکن مذہب کی مقدس ہستیوں سے گہری عقیدت و وارفتگی بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ رسالت مآبؐ، جناب حضرت امیرؑ اور امام حسینؑ کو شاعری میں جا بجا خراج تحسین پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اوہام کو ہر ایک قدم پر ٹھکراتے ہیں
ادیان سے ہر گام پہ ٹکراتے ہیں
لیکن جس وقت کوئی کہتا ہے، حسین
ہم اہل خرابات بھی جھک جاتے ہیں

امام حسین کے بارے میں خدا تعالیٰ سے شکوے کے انداز میں، ایک رباعی کے اندر جوش کا اندازِ شوخی بیان دیکھیں۔

اے بار الہ، نوحہ سناتا پھرتا
تا روز جزا اشک بہاتا پھرتا
امداد نہ کرتے جو ترس کھا کے حسین
اسلام تیرا ٹھوکریں کھاتا پھرتا

کربلائے کے دیگر ہم ترین کرداروں میں بی بی زینبؑ عالیہ کا شمار ہوتا ہے۔ سید سجاد بھی انہی کرداروں میں سے ایک ہیں۔ یہ دونوں، وہ عظیم کردار ہیں جنہوں نے کربلا کو نہ چھپنے دیا نہ مٹنے دیا، مشن کربلا کا دربار یذید میں بھی چرچا ان کی وجہ سے ہوا جوش ایک رباعی میں یوں خراج پیش کرتے ہیں۔

مقتل ہے رواں زینب خود دار کے ساتھ
شور طوفاں ہے چشم خوں بار کے ساتھ
غوغائے قیامت ہے رواں سوئے یذید
سجاد کی زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

ایک اور رباعی میں جناب زینب عالیہ کو حضرت عباس اور خود مولا علیؑ سے تشبیہ دی ہے۔

عباس علم کھول رہے ہیں گویا
شمشیر دودم ، تول رہے ہیں گویا
زینب سردربار ہیں سرگرم خطاب
میدان میں علی بول رہے ہیں گویا

رباعی، کے مخصوص اوزان میں سے جسے بھی شاعری نے رباعی میں استعمال کرنا ہو، اسے بہر طور چاروں مصرعوں میں نبھانا لازم ہوتا ہے، جبکہ شاعری کی دیگر اصناف میں بحر کی تو پوری غزل یا نظم میں پابندی کی جاتی ہے۔ مگر مختلف مصرعوں کے اوزان میں اسی بحر میں رہتے ہوئے ردو بدل کو جائز سمجھا جاتا ہے، اس طور سے

دیکھا جائے تو رباعی کہنا تیکنیکی لحاظ سے بڑا مشکل کام ہے۔اس کے علاوہ رباعی کا آخری مصرع ایسا جاندار ہونا چاہیے، جو الگ طور پر موثر بھی ہو اور معنی خیز بھی۔ جوش کی اکثر و بیشتر رباعیات کے یہ مصارع بڑے جاندر ہوتے ہیں۔ان کی آخری رباعی زور بیان کا عمدہ نمونہ ہے۔

سینے پہ مرے نقش قدم کس کا ہے
رندی میں یہ اجلال و حشم کس کا ہے
زاہد مرے اس ہاتھ کے ساغر کو نہ دیکھ
یہ دیکھ کہ اس سر پہ علم کس کا ہے

حوالہ جات

۱۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۴

۲۔ ایضاً، ص ۲۴۴

۳۔ ایضاً، ص ۱۹

۴۔ فیض احمد فیض، روزنامہ امروز، ۱۸ فروری، ۱۹۵۷ء،

۵۔ بحوالہ، نسیم عباس احمد، رباعیات جوش، مشمولہ: ادبیات، جوش نمبر، شمارہ ۸۷، اپریل تا جون ۲۰۱۰ء، ص ۲۱۲

۶۔ نسیم عباس احمر، رباعیات جوش۔ ایک مطالعہ، مشمولہ: ادبیات، جوش نمبر، شمارہ ۸۷، اپریل تا جون ۲۰۱۰ء، ص ۲۱۲

۷۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت وفن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۷

۸۔ محمد رضا، کاظمی، ڈاکٹر، رباعیات جوش، مشمولہ: ارتقا شمارہ ۲۴، جوش نمبر دسمبر ۱۹۹۹ء، تا مارچ ۲۰۰۰ء، ص ۳۵۱

باب پنجم:

حاصلات

جوش ملیح آبادی قادر الکلام زود گو شاعر تھے، اردو کی تقریباً تمام مروجہ اصناف ان کی تخلیقی قلمرو میں شامل ہیں، یہ اردو غزل کے مخالفین میں شمار ے ہوتے ہیں، تاہم کئی یادگار غزلوں کے جوش خالق بھی ہیں، جوش نظم کے علمبردار کے طور پر سامنے آئے، رباعیات میں نام پیدا کیا اور جدید اردو مرثیہ نگاری کے بانیوں میں اپنا نام لکھوایا، اس کے علاوہ ''یادوں کی برات'' جیسی خوبصورت نثری شاہکار آپ بیتی بھی اردو ادب کو ہدیہ کی، جوش کا ہمہ جہت تخلیقی کام تنقید و تحقیق کے بے شمار زاویے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ہر بڑی شخصیت کی طرح جوش بھی ہمیشہ متنازع رہے، ان کے حق میں اور خلاف لکھنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ جوش کی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گذرا، زیادہ تر شاعرانہ کام وہیں تخلیق کیا، قیام پاکستان سے پہلے ان کی متعدد کتب منظر عام پر آچکی تھیں، آٹھ، نو سال بعد از تقسیم جوش پاکستان مستقلاً آ گئے تو ان کا پہلا تخلیقی کام طلوع فکر جیسی اعلیٰ نظم کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ نظم جو درحقیقت ایک طویل مسدس ہے، مذہبی نوعیت کی شاعری ہے۔ اس کی پذیرائی کا جوش پر اتنا اثر ہوا کہ، ۱۹۶۱ء کے بعد دوبارہ مرثیہ نگاری کی طرف دھیان دیا اور یکے بعد دیگرے پاکستان میں سات مزید مرثیے، اردو ادب کے سپرد کیے، اس سے پہلے ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۶۱ء تک جوش صاحب نے صرف دو مرثیے تخلیق کیے تھے۔

زیر نظر کیفیتی و مقداری تحقیق میں ہم نے جوش کے انہی کل ۹ مراثی کو ان کے خیالات کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ مرثیہ سے متعلق جوش کے تصورات ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ مختلف مواقع پر دوسرے لوگوں کی کتابوں پر رائے دیتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ہلال نقوی صاحب کے انٹرویو سے پہلے بھی کافی سے زیادہ باتیں مترشح ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں، ان کے شعروں سے بھی اپنے تصور مرثیہ نگاری کی وضاحت ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا باتوں کو بنیاد بنا کر ہم نے جوش صاحب کی فکر کو ان کی مرثیہ نگاری سے اجاگر کیا ہے، اس سے پہلے جوش کے مراثی پر اس نوعیت کا کام اردو ادب میں نہیں تھا، دو اشخاص نے ان کے مراثی کی تدوین کا تحقیقی کام سرانجام دے دیا تھا، لیکن مراثی پر فرداً فرداً فکری و فنی نوعیت کا کام نہیں تھا۔ البتہ اکا دکا ان کے مراثی پر اجمالی طرز کے مضامین کچھ احباب نے ضرور لکھ رکھے تھے۔

میری اس حالیہ تحقیق و تنقید کا رخ زیادہ تر جوش صاحب کے نظریات کی طرف رہا ہے۔ البتہ ذیلی طور

پر کچھ فنی مباحث کو بھی بوقت ضرورت کسی حد تک چھیڑا گیا ہے۔ جوش سے پہلے اردو مرثیہ نگاری کا رجحان فکری و فنی ہر دو لحاظ سے کلاسیکی کی روایت کا تتبع کرنا ہی تھا۔

ایک طرف تو مرثیہ گو شعرا مرثیہ کے اجزا کی ضرور پابندی کیا کرتے تھے، تقریباً ہر مرثیہ میں، چہرہ، سراپا، رخصت آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین اور دعا و اختتام کا التزام کیا جا رہا تھا، لیکن جوش صاحب کی مستقبل گیر نظر نے جدید حالات کو دیکھتے ہوئے یہ بھانپ لیا تھا کہ مرثیے کا کلاسیکی رجحان جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ تلوار اور گھوڑے پر جدید دور میں تخیل کے گھوڑے دوڑانا تضیع وقت کے سوا کچھ نہیں۔ جوش نے باقاعدہ اپنے مراثی میں اس بات کو پیش نظر رکھا اور گھوڑے اور تلوار کے مضامین میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اور یہ ثابت کرنے کی ایک سعی کی ہے کہ اس کے بغیر بھی مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔

جوش نے اس سلسلے میں جو تجربات کیے ہیں وہ زیادہ تر فکری ہیں۔ فنی لحاظ سے وہ اپنے مخصوص اسلوب شعر کو برقرار رکھتے ہوئے نظر آئے۔ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کو جوش صاحب نے قطعاً اہمیت نہیں دی اور نہ ہی ان کی مخصوص ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا۔ البتہ، تمام مرثیوں میں مرثیے کا آغاز چہرے ہی سے کیا۔ ان کے ہر مرثیے میں چہرہ جداگانہ رنگ کا حامل ہوتا ہے۔ خصوصاً آگ، پانی اور موجد و مفکر میں چہرے کی شان نرالی ہے، ان چہروں پر قصیدے کی تشبیب کا گمان ہوتا ہے۔

جوش کے تمام مرثیوں کا مرکزی کردار امام حسین ہے، لہٰذا ہر مرثیے میں ان کی جنگ کا مضمون کلاسیکی مرثیے کی طرح لانا تکرار کے مترادف تھا، لہٰذا جوش نے موقع محل کی مناسبت سے، امام کی جنگ کو کئی فکری زاویوں سے جوڑ کر پیش کیا ہے، وہ جنگ کربلا کے میدان کی جنگ سے نکل کر ہمیں زندگی کے میدان کو فتح کرنے کی جنگ محسوس ہوتی ہے، جسے وقت کے شمر و یذید اور باطل قوتوں کے خلاف پیکار پیہم بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

جوش کی یہی فکری جہت اس مرثیہ کے بارے میں اپنے خیالات میں بھی پائی جاتی ہے۔ فکری طور پر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جو کچھ مرثیہ کے بارے میں جوش کہا کرتے تھے وہ سب کچھ، اس کے مرثیوں

سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی وہ مرثیے کو بیداری اور تاسی حسین کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے حامی تھے، یہ بات پورے اہتمام کے ساتھ جوش نے مرثیوں میں بھر دی۔

آوازۂ حق، جو، ان کا پہلا مرثیہ ہے، اسے چھوڑ کر باقی تمام مراثی میں بین نہ ہونے کے برابر ہے۔ جوش صاحب اس خیال کے پر جوش حامی تھے کہ مرثیے کی تان رونے پر نہیں ٹوٹنی چاہیے، آہ و بکا کو وہ مرثیے کی مقصدیت نہیں سمجھتے اور صرف رلانا، ان کے نزدیک کوئی منطقی بات بھی نہیں، لہٰذا اپنے تصور مرثیہ نگاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے مرثیوں کی مجموعی فضا جلالی ہے، جس میں امام حسین کی شخصیت کا طنطنہ، رعب اور جلال چھایا ہوا ہے۔

کلاسیکی مرثیے میں اپنے مرثیوں کی تعداد بڑھانے کے لیے کربلا کے تمام مشہور کرداروں پر شعرا نے مرثیے لکھے، لیکن جوش کے ہاں ایسا نہیں، وہ مرثیوں کی تعداد بڑھانے کے لیے کرداروں کے بجائے نئے مضامین کی کھوج میں سرگرداں نظر آتے ہیں، یہ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں کثرت سے جدید مضامین پائے جاتے ہیں۔ جن میں سائنس، سماج، اقتصادیات و سیاسیات اور ارتقا سے متعلق سبھی مضامین شامل ہیں۔ اس سے پہلے ان مضامین کا دروازہ مرثیے کے لیے بند تھا۔

آہ و بکا، بین اور رونا رلانا، جوش کے ہاں اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ اسے مقصد بنانے کے بالکل خلاف ہیں۔ اس کی طرف انہوں نے شعروں میں جا بجا متوجہ کیا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار انٹرویو میں بھی کیا ہے، یہاں پر یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں وضاحت کرتے ہین کہ امام کو ذرہ ذرہ روتا ہے، اور جیسی امام کی عظیم شخصیت ہے، اس پر جو مظالم ڈھائے گئے ان پر رونا عین ثواب ہے اور جو بھی امام سے محبت وعقیدت رکھے گا امام کے واقعات سن کر تڑپ اٹھے گا، رو پڑے گا، اموی و سیاسی دور کی مطلق العنان بادشاہوں کے دور میں، رونے ہی کو وہ احتجاج کا ایک مناسب انداز سمجھتے ہیں۔ لیکن جدید جمہوری دور میں امام کی شخصیت کے بہادرانہ رخ کو بین پر حاوی رکھنا جوش صاحب نے زیادہ مناسب سمجھا ہے۔

ہئیت کے اعتبار سے جوش نے مسدس کو ہی مرثیہ کے لیے موزوں سمجھا اور تمام مراثی میں اسی ہئیت کے

اندر رہ کر اپنے مضامین پیش کیے۔ اس لحاظ سے وہ جدت کے قائل نہیں۔ کیونکہ مسدس کی ہئیت مجمع کے سامنے آواز کا زیر و بم قرأت کے لیے، بلکہ خطابت کے لیے موزوں ہے۔

جوش کے مرثیے فکر کے نئے در کھول رہے ہیں ان میں فکری تنوع ہے، مخصوص مضامین کے علاوہ حیات و کائنات کے گوناگوں مسائل کو بھی مرثیے کے لیے جوش نے قابل قبول بنا دیا ہے۔ یہ بات باور کروانے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں کہ مرثیہ ثواب کے حصول کے علاوہ خالصتاً دنیوی زندگی کی ضرورت کے لیے بھی لکھا جاسکتا ہے۔ اگر ایسا مرثیہ ادبی ضرورتوں اور شعری جمالیات کو پورا کر رہا ہے تو اسے رواج دینے میں کوئی قباحت نہیں۔ جوش کے مرثیوں میں مذہبی و دینی فکر غالب نہیں، بلکہ ان میں خالصتاً عقلی، منطقی، سوچ کی عکاسی کرنے والے دنیوی مقاصد کے حامل مضامین ملتے ہیں۔ اس سے پہلے کم از کم اردو مرثیہ نگاری میں یہ مثالیں نہیں ہیں۔

جوش کے ان مرثیوں میں فن کی جمالیات کو پورے اہتمام کے ساتھ اجاگر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ موضوع کی تحدید ایسی تھی کہ زیادہ تر مراثی کے فکری پہلوؤں کو ہی پیش نظر رکھنا پڑا، میں سمجھتا ہوں کہ مستقبل کے محققین کے لیے اس باب میں وسیع امکانات موجود ہیں جوش، ایسا شاعر نہیں جو دھڑا دھڑ خیالات پیش کیے جا رہا ہو اور فن اور فن کی تمام تر رعنائیوں کا خیال نہ رکھ رہا ہو۔

جوش ذاتی طور پر ان ''مسدسوں'' کو مرثیہ ہی سمجھتے تھے، اسی لیے ہم نے بھی جوش کی رائے کے مطابق ان کے اس رثائی ادبی کام کو مرثیہ ہی خیال کیا، ہاں، کچھ ماہرین فن کے نزدیک یہ مرثیہ کے بجائے مسدس ہیں، مرثیے نہیں ہیں، لہٰذا اس ادبی کام کو ان کے نقطہ نظر کے مطابق بھی دیکھنے کی گنجائش موجود ہے، ان مرثیوں میں جوش کی زبان کے ادبی پہلوؤں پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی، جوش کے اسلوب شعر کو بھی زیادہ تر بحث سے خارج ہی رکھا گیا ہے۔ ان پہلوؤں پر کام کرنے کی ہمیشہ گنجائش رہے گی کہ جوش نے بڑے شعرا کی طرح وسعت زبان اور اس کے فروغ کے لیے کیا ادبی خدمات سرانجام دی ہیں۔

مرثیہ خصوصاً اردو مرثیہ نگاری، خالصتاً برصغیر کی صنف شاعری ہے، اردو مراثی کے اندر یہاں کی رہتل بہتل، تہذیب و ثقافت کو بڑی آب و تاب سے دکھایا جاتا رہا ہے۔ مرثیہ کے کرداروں کے پس پردہ یہاں کا

مقامی نظام اقدار کارفرما رہا ہے، ان کرداروں کے ذریے ہم مختلف خونی وسماجی رشتوں کی قدر و قیمت کا درس لے رہے ہوتے ہیں۔

کلاسیکی مرثیوں میں برصغیر کا پورا نظام معاشرہ ہمارے سامنے جیتا جاگتا، دکھائی دیتا ہے، لیکن جوش کا مرثیوں میں مقامی ثقافت کو کلیت کے ساتھ دکھانا مقصود نہیں تھا، ان مراثی میں تہذیب و ثقافت کے یہ رنگ دیکھنے سے ہم قاصر رہتے ہیں، البتہ ہمارے سیاسی وسماجی نوعیت کے بیشتر رویے اپنی اصلیت کے ساتھ ہمارے سامنے کھلتے چلے جاتے ہیں اور ہم اپنے عہد کو کسی قدر وجھانک کر دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جوش ،ہوش کے ناخن لینے کی تربیت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

جوش کے مراثی کو ترقی پسند تحریک کے پس منظر میں بھی دیکھنے کی گنجائش موجود ہے۔ ان کا جھکاؤ بھی اسی تحریک کی طرف تھا اور وہ ذاتی طور پر خود مذہبی علمی شخصیت بھی نہیں تھے، کچھ لوگوں جن میں شفقت رضوی قابل ذکر ہیں، نے اپنی تنقیدی کتاب میں اس کے اشارے بھی کیے ہیں، نئی بحث کے طور پر جوش کے مراثی پر اس لحاظ سے بھی بات ہوسکتی ہے۔ان مرثیوں کو سامنے رکھ کر یہ بات بھی دائرہ تحقیق میں لائی جاسکتی ہے کہ جوش کے بعد جوش کا تتبع ہوا یا نہیں ہوا۔ ویسے تو جدید عہد میں بھی اگر کوئی کلاسیکی روایت کا حامل مرثیہ لکھ رہا ہے تو جوش اسے قدیم مرثیہ ہی کہتے ہیں، لیکن پھر بھی اگر کسی نئے مرثیہ نگار کے ہاں اجزاء کی مخصوص ترکیب و ترتیب میں انحراف آیا ہے اور کچھ جدید تقاضوں کے مطابق نئے مرثیے کی نئی صورت گری ہورہی ہے، تو اسے جوش کے اثرات ہی سمجھا جائیگا، لہٰذا جدید اردو مرثیہ نگاری میں جوش کے اثرات کا جائزہ لینا، ایک تحقیق طلب میدان ہے جسے ڈھونڈنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

جوش کے مراثی کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل ممکنہ موضوعات کو تلاش کیا جاسکتا ہے، اس جانب آنے والے محققین کو مائل کیا جاسکتا ہے،

- ☆ جوش کا لسانی شعور
- ☆ جوش کے عقائد ونظریات

☆ جوش کا تصور آدمیت

☆ جوش کا نفسیاتی شعور

☆ جوش کا سیاسی وسماجی شعور

☆ جوش اور حُب اہل بیت

☆ مابعد نو آبادیات اور جوش

پروفیسر سحر انصاری نے بھی اپنے ایک مضمون ''جوش شناسی کے ممکنہ زاویے'' مشمولہ ''ماہ نو'' ۲۰۱۶ء جوش نمبر میں اس جانب توجہ مبذول کروائی تھی، ان مراثی کے اندر جوش کی تلمیحات بڑی تحقیق طلب ہیں جوش کی تشبیہات واستعارات پر ایک وقیع کام ہوسکتا ہے۔

الغرض، جوش کے مرثیوں کا فکری جائزہ لینے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ مرثیے جوش کے تنقیدی تصورات کے آئینہ دار ہیں وہ اس سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ وہ روایتی مرثیہ نہیں تخلیق کر رہے بلکہ مرثیہ نگاری کا ایک جدید انداز متعارف کروا رہے ہیں۔ ان کے مرثیوں کو ''مسدس'' کہنے والے ناقدین کی رائے سے قطع نظر جوش کی اس سلسلے میں ذاتی رائے کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ جوش کس قدر کمٹمنٹ کے ساتھ جدید مرثیہ نگاری کے خدوخال تشکیل دے کر، اسے استوار کر رہے تھے۔

کلاسیکی مرثیہ، روز اول ہی سے اس صورت میں متشکل نہیں ہوگیا تھا، بلکہ اردو مرثیہ ہئیت اور اس کی اندرونی ساخت کے اعتبار سے مختلف مراحل سے گذر کر اس مقام پر پہنچا، جہاں پر اسے انیس و دبیر نے آسمانی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

مرثیہ ہئیت کے اعتبار سے کئی اصناف میں لکھا جاتا رہا، دکنی مرثیہ زیادہ تر مثنوی کی ہئیت میں ظہور پذیر ہوا، اور اس کے اجزاء کی ترکیب بھی واضح نہیں تھی، جب یہ مرثیہ دلی میں آیا تو یہاں بھی کئی تجربات سے گذرا، مرزا رفیع الدین سودا نے ہئیت کے کئی ایک تجربے کیے اور آخر کار مسدس کو اس کے لیے موزوں قرار دیا۔ لکھنؤ

میں اس ہئیت کو قبولیت عامہ حاصل ہوگئی تو مرثیہ گو شعراء نے ہئیت کے بجائے اس کے اجزا کو مخصوص کرنے کی طرف توجہ دی، چنانچہ میر ضمیر نے جن اجزاء کو مرثیہ کے لیے لازمی قرار دے دیا، بعد کے تمام مرثیہ گو شعراء نے اس پابندی کا خیال رکھا، انیس و دبیر نے انہی اجزاء کی پابندی کے ساتھ نئے سے نئے مضامین کی تلاش شروع کر دی۔ اور مرثیے کے بندوں کی تعداد میں ہوش ربا اضافہ کرتے گئے، ان کے بعد بھی مرثیہ اسی پرانی ڈگر پر چلتا رہا، بعد کا کوئی شاعر انیس و دبیر کی گرد کو بھی نہ چھو سکا، اس مختصر تاریخ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی بھی صنف شاعری جب تشکیل پا جاتی ہے تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی، مذاق زمانہ جب بدلتا ہے، ان اصناف میں بھی فکری وفنی تغیرات کے در کھلتے چلے جاتے ہیں، اور جوش، جیسے اہم شاعر سے ایسی تبدیلیاں لانا کچھ بعید بھی نہیں ہوتا۔ جوش نے ایک تو اس کے مضامین میں وسعت پیدا کی ہے اور نئے خیالات کو مرثیے کو موضوع بنایا ہے اور دوسرے مرثیے کی داخلی ساخت کو بھی تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی کلاسیکی مرثیے کے اجزائے ترکیبی کی پابندی کو توڑ کر اس میں مزید وسعت اور تبدیلی کے امکانات پیدا کر دیے ہیں۔

جوش نے کلاسیکی مرثیے سے ایک اور لحاظ سے بھی انحراف کیا ہے، وہ یہ کہ اپنے مرثیوں کو نظم کی طرح باقاعدہ عنوان دے کر پیش کیا ہے، اس سے پہلے مرثیے کو قصیدے کی طرح پہلے مصرع سے ہی یاد کیا جاتا تھا۔ جوش نے کچھ مرثیوں میں مرثیے کو اجزا کے بجائے ذیلی عنوانات میں بھی منقسم کیا ہے جن کو مرثیے کے ابواب کہا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جوش کے ہاں مرثیہ نگاری میں فکری وفنی ہر دو لحاظ سے واضح جدت طرازی نظر آتی ہے۔ جیسا کہ ہر دور میں کچھ لوگ ان جدتوں کو بخوشی قبول کر لیتے ہیں اور ایک بڑا طبقہ شروع شروع میں ان کی مخالفت بھی کرتا ہے جوش کے مرثیوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ انہوں نے اپنے طور پر اس میدان میں ایک تجربہ کر دیا ہے، آنے والا وقت بتائے گا یہ تجربہ کتنا مستقبل گیر ثابت ہوا۔

ہم نے اس مقالے میں جوش کے مرثیے کی فکری جہات کو پیش نظر رکھا کہ وہ اپنے ہی طے کردہ اصولوں کی روشنی میں کس قدر کامیاب ہوئے ہیں۔ کامیابی کا سرٹیفکیٹ تو ہم دینے سے قاصر ہیں البتہ جوش کی مرثیہ نگاری ان کے نظریات کی آئینہ دار ہے، جو کچھ انہوں نے مرثیہ کے بارے میں کہا، وہ ان کے مرثیوں سے جھلکتا بھی ہے، آنے والے محققین ان مرثیوں کا فنی جائزہ بھی لے سکتے ہیں کہ فن کی جمالیات کا جوش نے کس

قدر مظاہرہ کیا ہے۔ اپنے عہد کے دیگر مرثیوں نگاروں سے ان کا موازنہ بھی ایک اہم قابل تحقیق موضوع ہوسکتا ہے۔

کتابیات

۱۔ ملیح آبادی، جوش، مقتل و مشعل (دیباچہ) مشمولہ: اذان مقتل، مصنفہ: ہلال نقوی، محمدی ٹرسٹ لندن، کراچی، ۱۹۶۷ء

۲۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، عرفانیات جوش (مرتبہ)، ادارہ حیاء تراث اسلامی، کراچی، ۱۹۹۲ء

۳۔ نقوی، ضمیر اختر، ڈاکٹر، اردو مرثیہ پاکستان میں، مرکز علوم اسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۲ء

۴۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سنٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء

۵۔ کاظمی، محمد رضا، جدید اردو مرثیہ، مکتبہ ادب کراچی، ۱۹۸۱ء

۶۔ صفدر حسین، سید، ڈاکٹر، مرثیہ بعد انیس، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہو، ۱۹۷۱ء

۷۔ زاہد ہمایوں، مراثی انیس کے جمالیاتی عناصر، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

۸۔ ضمیر اختر، نقوی، ڈاکٹر، اردو مرثیہ پاکستان میں، مرکز علوم اسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۶ء

۹۔ رضوی، فضل امام، مراثی جوش اور تحفظ حقوق انسانی، مشمولہ: ماہ نو، جوش ملیح آبادی نمبر، لاہور، ۲۰۱۶ء

۱۰۔ عاشور کاظمی، سید، جوش کی مرثیہ نگاری عالمی تناظر میں، مشمولہ: ماہ نو، جوش ملیح آبادی نمبر، لاہور، ۲۰۱۶ء

۱۱۔ عبدالحق، مولوی، تبصرہ بر آواز حق، مشمولہ: سہ ماہی، اردو، دکن، اپریل ۱۹۲۲

۱۲۔ ضمیر اختر، نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، مرکز علوم اسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۲ء

۱۳۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء

۱۴۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جدید مرثیے کے تین معمار، پاکستان ریڈرز گلڈ، کراچی، س ن

۱۵۔ صفدر حسین، سید، ڈاکٹر، مرثیہ بعد انیس، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۱ء

۱۶۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء

۱۷۔ ملیح آبادی، جوش، یادوں کی برات، جوش اکیڈیمی، کراچی، ۱۹۷۰ء

۱۸۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء

۱۹۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء

۲۰۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء

۲۱۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء

۲۲۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء

۲۳۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء

۲۴۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء،

۲۵۔ ملیح آبادی، جوش، یادوں کی برات، جوش اکیڈیمی، کراچی، ۱۹۷۰ء

۲۶۔ شفقت رضوی، جوش ملیح آبادی، تحقیق اور تنقید کی زد میں، فضلی سنز کراچی، ۲۰۰۱ء

۲۷۔ تقی عابدی، ڈاکٹر، جوش کی مرثیہ نگاری، مشمولہ: ارتقا، جوش نمبر، ۱۹۹۹ء

۲۸۔ شفقت رضوی، جوش ملیح آبادی تحقیق اور تنقید کی زد میں، فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی، ۲۰۰۱ء

۲۹۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء

۳۰۔ پریم چند، ادب کی غرض و غایت، مشمولہ: ارتقا، ۲۰۰۶ء

۳۱۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء

۳۲۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جدید مرثیہ کے تین معمار، پاکستان ریڈرز گلڈ، کراچی، سن ندارد

۳۳۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء

۳۴۔ ضمیر اختر، نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، مرکز علوم اسلامی، کراچی، ۱۹۸۲ء

۳۵۔ شفقت رضوی، جوش ملیح آبادی، تحقیق وتنقید کی زد میں، فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی، ۲۰۰۱ء

۳۶۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، محمدی ٹرسٹ، لندن، کراچی، ۱۹۹۴ء

۳۷۔ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، جوش کی مرثیہ نگاری، مشمولہ: ارتقا، جوش صدی نمبر ۱۹۹۹ء

۳۸۔ ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر، اردو مرثیہ پاکستان میں، مرکز علوم اسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۲ء

۳۹۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کے انقلابی مرثیے، توحید اسلامک سینٹر، اوسلو، ناروے، ۲۰۱۰ء

۴۰۔ فیض احمد فیض، روزنامہ امروز، ۱۸ فروری، ۱۹۵۷ء

۴۱۔ بحوالہ، نسیم عباس احمد، رباعیات جوش، مشمولہ: ادبیات، جوش نمبر، شمارہ ۸۷، اپریل تا جون ۲۰۱۰ء

۴۲۔ نسیم عباس احمر، رباعیات جوش۔ ایک مطالعہ، مشمولہ: ادبیات، جوش نمبر، شمارہ ۸۷، اپریل تا جون ۲۰۱۰ء

۴۳۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت وفن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

۴۴۔ محمد رضا، کاظمی، ڈاکٹر، رباعیات جوش، مشمولہ: ارتقا شمارہ ۲۴، جوش نمبر دسمبر ۱۹۹۹ء، تا مارچ ۲۰۰۰ء